جلد ۱۰۲ دسمبر ۱۹۸۴ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

موسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ

کا دفتر

اچھرہ سے تبدیل ہو گیا ہے۔

کرم فرماؤں سے گذارش ہے کہ دفتر سے ہر قسم کے رابطہ اور
خط و کتابت کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر رجوع فرمائیں۔

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ

گنج بخش روڈ، دربار مارکیٹ نزد داتا دربار لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	دسمبر ۱۹۸۴ء مطابق ربیع الاوّل ۱۴۰۵ھ	جلد ۱۰۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

انتخابات کا چرچا تو ہے مگر کسی کو نہیں معلوم کہ کب ہوں گے اور کیسے ہوں گے بہر صورت سیاسی و صحافتی حلقوں میں یہ ضرور محسوس کیا جا رہا ہے کہ انتخابات کے عنوان سے کچھ نہ کچھ جلد ہی ہونے والا ہے اور زیادہ تاخیر والتوا کا ملکی حالات، بین الاقوامی معاملات اور خود موجودہ اقتدار پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔

ہماری خواہش تو یہ ہے کہ انتخابات اگر ہوں تو کسی اچھی اسکیم پر ہوں، لیڈروں کے غبار میں چھپے ہوئے چہرے سامنے آجائیں، سیاسی جماعتوں کا تشخص کالعدمین کے پردے سے نکل کر نمایاں ہو اور بجائے اس کے کہ متفرق افراد روپے پیسے، جاگیرداری، برادری اور غنڈہ گردی کے دباؤ سے (جو بسا اوقات خفیہ ہوتا ہے)، بازی جیتیں، منظم افراد معقول اصول و مقاصد پر مبنی منشوروں کی بنیاد پر اپنی قابلیت و شرافت کے بل پر کامیابی حاصل کریں بہت ہی معیاری صورت تو یہ ہے کہ متناسب نمائندگی کے اصول کو اختیار کر کے لسٹ سسٹم یا پریفرنشل سسٹم کے مطابق نمائندے منتخب کیے جائیں، تاکہ نہ کوئی ایک ووٹ ضائع ہو اور نہ کسی فریق کا حق مارا جائے۔ عوام محض مقاصد کو دیکھیں یا پھر کسی جماعت یا گروہ کے مجموعی کردار اور اس کے پچھلے ریکارڈ پر نظر ڈالیں، انہیں فرد فرد کے لیے الگ الگ کاوش نہ کرنی پڑے۔ یہ طریقہ ہو تو علاقائی پارٹیوں اور لیڈروں کے مقابلے میں پورے قومی دائرے میں

اثر رکھنے والی اور ملک کی وحدت کا تحفظ کرنے والی قوتوں کو اہمیت حاصل ہوگی۔ ایسی صورت میں بالعموم کوئی خاص فرد کسی خاص محدود علاقے (حلقے) میں روپیہ تقسیم کر کے یا برادری کی قوت استعمال کر کے یا بیوروکریسی یا غنڈوں کے ساتھ گٹھ جوڑ رکھنے کے بل پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا، نیز علاقائی، نسلی یا لسانی نعرے پورے ملک کی فضا میں رسوخ حاصل نہیں کر سکتے۔

با اختیار سوچنے والوں کی نگاہیں اگر ان تمام باریکیوں تک پہنچ سکیں تو وہ اس طریق انتخاب کو بہترین تسلیم کریں گے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ انتخابات ایک جمہوری عمل ہیں۔ اگر وہ مخالف جمہوریت[1] رجحانات

---

[1] اسلام اور جمہوریت کو متضاد قرار دینے والے حضرات کی دلیل یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ جمہوریت تو مغرب کی ایجاد ہے اور مغربی جمہوریت میں بے شمار گندگیاں ہیں، لیکن ان میں سے بعض کو علم ہی نہیں اور بعض مجہول جاتے ہیں کہ لفظ جمہور کا استعمال ہمارے دینی لٹریچر کے ابتدائی دور سے شروع ہوا ہے، جب کہ مغرب میں اس کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ مغرب نے جمہوری تصور یونان سے لیا۔ مگر اس کی اصل ہمارے ہاں الگ سے موجود تھی۔ فقہ کی کتابوں میں آپ کو یہ فقرہ اکثر ملے گا کہ جمہور علماء کا قول یہ ہے یا جمہور فقہا فلاں چیز کے خلاف ہیں۔ ایسے مقامات پر ہمیشہ اکثریت مراد ہوتی ہے۔ پھر اسی سے اجماع کا تصور پیدا ہوا جو سراسر جمہوری معنویت رکھتا ہے۔ یعنی ایسے شرعی اصول یا مسائل جن کی کتاب وسنت میں صراحت و وضاحت نہ تھی، مگر کتاب وسنت کی روشنی میں نصوص کی دلالت و اشارت سے صحابہ، خلفائے راشدین یا جملہ علماء ایک خاص توضیح و تعبیر یا اجتہاد پر متفق ہو گئے۔ اجماع سیاسی بھی ہوتا ہے اور علمی بھی۔ سیاسی اجماع کی بڑی مثال حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر مدینہ کے تمام سرداران مہاجرین و انصار کی بیعت خاص تھی۔ سعد بن عبادہ بگڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس پر جواب دیا گیا کہ "انما ھو رجل واحد" یعنی (باقی بر صفحہ آئندہ)

جو پچھلے دنوں اسلام کے حوالے سے کھمبیوں کی طرح پیدا ہوئے ہیں، وہ برحق سمجھے جائیں تو سرے سے انتخابات کا ڈراما رچانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ جس طرح موجودہ وفاقی مجلسِ شوریٰ کے ممبران

(حاشیہ صفحہ سابقہ) وہ تو بس ایک فریق واحد ہیں جنھوں نے اختلاف کیا، کوئی قبیلہ یا گروہ ان کے ساتھ نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا اختلاف بے وقعت ہے۔ پھر اجماع تام یا کامل بھی ہوتا ہے اور ناقص بھی۔ تام وہ جس پر سارے متعلقہ اصحاب کا پورا اتفاق ہو، ناقص وہ جس پر بھاری اکثریت جمع ہو جائے۔ اتنی ہی بات سے اسلام کا تصورِ جمہوریت اخذ کیا جا سکتا ہے۔ رہی اس کے متعلق اصولی بحث، سو یہاں ہم نہیں کر سکتے۔ البتہ اتنا کہنا ضروری ہے کہ مغربی نظام جمہوریت کی گندگیوں کو اسلامی تصورِ جمہوریت کے سر لا منڈھنا بڑی زیادتی ہے۔ یہاں صاحب حاکمیت صرف رب العٰلمین ہے، عوام نہیں؛ قانون کا سرچشمہ کتاب و سنت ہے، تفصیلات میں قانون سازی صرف تعبیر، قیاس، انطباق، اجتہاد کی حد تک ہے۔ نیز امیر، ماتحت حکام اور ارکانِ مجالسِ شوریٰ کے لیے معیار مقرر ہیں۔ انتخابات میں طلبِ منصب اور امیدواروں کے علاوہ جاہلی عصبیتوں کو بھڑکانا یا دھونس، دھن، دھاندلی سے اکراہ کی صورت پیدا کر دینا ممنوع ہے، فسوق و جدال کی اجازت نہیں۔

پھر اسلام کے نام پر شوریٰ کے مقابلے میں امیر کو اصل اتھارٹی دینے والے حضرات ذرا اس بات کا جواب دیں کہ کیا وہ ایسی فرم میں سرمایہ کاری یا حصہ داری کر سکتے ہیں جس کے تمام ڈائریکٹران کے مشورے کو درکنار رکھ کر چیف ڈائریکٹر جو چاہے فیصلہ کر دے؟ آخر جمہوریت کا جو بھی تصور آپ اپنائیں اُسے گھر کے انتظام، کاروباری نظم، کھیل کے میدان اور دوسرے تمام دائروں میں بھی استعمال کرنا ہوگا۔ آپ اسلامی شورائیت کی جو تعبیر بھی کریں، ذرا اُسے اپنے تمام معاملات پر لاگو کر کے دیکھیں، تب ان دونوں کی کلامی اور "کاملانہ" بحثیں بالکل خام دکھائی دیں گی۔ اسلامی جمہوریت میں بھی اکثریتی رائے کو اہمیت حاصل ہے، اگرچہ معاملات و مسائل کو پیش کرنے اور ان پر بحث کرنے اور ان کا فیصلہ کرنے اور رائیں تبدیل کرنے کے لیے دلائل اسلامی مآخذ سے لیے جائیں جن کا دارومدار تمام تر اندھی افادیت پرستی اور گروہ پرستی پر نہیں ہوتا بلکہ اسلام کے عطا کردہ اخلاقی شعور کو زیادہ اہمیت سے ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس موقع پر یہ چند اشارات کافی ہیں، ورنہ یہ مبحث بڑی تفصیل چاہتا ہے۔

کو ان کے شجرہ ہائے نسب کریدنے کے بعد چھانٹ پرکھ کر لیا گیا ہے، اسی طرح قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ (یا اسے بھی مجلسِ شوریٰ ہی کہہ لیجیے) کے ممبران کو بھی ملک بھر سے چُن لیجیے۔ لیکن اگر انتخابات کے معنی یہ ہوں کہ واقعی عوام کی اکثریتی رائے سے موزوں یا بہترین افراد کو چُنا جانا ہے تو پھر انتخابات کے کم سے کم درجے کے تقاضوں کو تو پورا کرنا چاہیے۔ لوگوں کو حقِ تنظیم، حقِ اظہار، حقِ اجتماع، حقِ تنقید و اختلاف ضرور دیا جائے اور ذرائع ابلاغ کے گلے کو (سوائے اخلاقی پابندیوں کے، ہر قسم کے امتناع اور "ایڈوائس" کے بندھنوں سے) آزاد کر دیا جائے۔ بطورِ احتیاط کچھ ایسی پابندیاں ان حقوق پر رکھی جا سکتی ہیں جو اس بات کی ضمانت ہوں کہ ہنگامہ آرائی نہیں ہوگی، بد زبانی اور بدنویسی نہیں ہوگی، فرقہ وارانہ نزاعات نہیں ہوں گی، ملی وحدت کو تباہ کرنے والے تعصبات کو نہیں اُبھارا جائے گا، یا مثلاً پبلک مقامات پر بڑے بڑے جلسوں کا انعقاد نہیں ہوگا، وغیرہ۔ چونکہ ان میں سے بعض پابندیوں کے لیے اس وقت کے مخصوص حالات کی وجہ سے جواز پیدا ہوتا ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ پہلے سے موجود معلوم سیاسی لیڈروں، اہلِ صحافت، وکلا اور اساتذہ کے اہم ترین افراد میں سے چار چار پر مشتمل ایک مجلس بُلوائی جائے اور اُسے کسی مناسب فارمولے پر متفق کیا جائے۔ یہ طریقے جمہوریت کے تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ اب تک کوئی انتخابی نقشہ سامنے لایا ہی نہیں گیا، چاہیے یہ تھا کہ ایک ایک کر کے ہر ضروری چیز قوم کے سامنے رکھ دی جاتی۔ اور اخبارات اور مجالس میں ان پر بحث کرنے کا موقع دیا جاتا — اس طرح حکومت کو معلوم ہو جاتا کہ جس معاشرے کے لیے کوئی فیصلہ کیا جا رہا ہے، اس کا ذہن کہاں تک اسے قبول کرتا ہے اور کتنی توقع اس سے کی جا سکتی ہے کہ وہ پوری طرح مطمئن ہو کر دل و جان سے اس کو کامیاب کرائے۔

ہم تو بے چارگی سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ کلھیا میں گُڑ پھوڑا جا رہا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ شوق سے گُڑ پھوڑیئے مگر قوم کو اتنا بتا تو دیجیے کہ ہم گُڑ پھوڑ رہے ہیں، دال نہیں بگھار رہے۔

مگر انتخابات جیسے بھی ہوں، ہماری رائے یہ ہے کہ ان میں قوم کو حصہ ضرور لینا چاہیے۔ آخر اس سے پہلے ایوب خاں صاحب کی بنیادی جمہوریت کے تحت ہونے والے غیر جمہوری انتخابات میں بھی تو حصہ لیا جا چکا ہے۔

غور طلب امر یہ ہے کہ آپ فوجی حکومت سے اقتدار نہ زور زبردستی سے تو چھین نہیں سکتے اور نہ کسی دباؤ سے اپنی پسند کے انتخابات کرا سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ انتخابات مزید کچھ مدت کے لیے ملتوی ہو جائیں۔ کوئی اودھم مچانا تو ممکن نہیں، ایم۔ آر۔ ڈی کے فسٹ راؤنڈ کا بھی دوہرایا جانا اب مشکل ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ کا کوئی غیر جمہوری منصوبہ کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ بھی ایک "تازہ دم" مارشل لا کا نفاذ ہے۔ بلکہ ماہر تکبیر صلاح الدین صاحب کا یہ تجزیہ درست ہے کہ ہمارے مسلم ممالک میں معاشروں کے حالات ایسے ہیں کہ سیاست سے فوج کو پوری طرح لاتعلق رکھنا محال ہے نہ عوام میں شعور ہے، نہ کسی جگہ ایک یا دو سیاسی پارٹیوں کا ملک گیر اثر و نفوذ ہے، نہ لیڈروں میں اصول پسندانہ کردار ہے، نہ کوئی حکومت بیوروکریسی کی چیرہ دستیوں اور سازشوں سے عوام کو بچا سکتی ہے۔ اندریں حالات بار بار خلفشار اور بحران پیدا ہوتے ہیں، جن پہ سیاسی قوتیں قابو پانے سے عاجز آجاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مؤثر قیادت کا خلا فوج کو بیرکوں سے کھینچ کر لے آتا ہے۔

اندریں حالات بہتر راستہ یہی ہے کہ فوج سے ٹکراؤ کے حالات پیدا کرنے کے بجائے حالات کے تغیرات سے فائدہ اٹھا کر افہام و تفہیم کے ذریعے ایسی صورتیں پیدا کی جائیں کہ فوجی حکومت اپنے ہاتھوں سے تبدیلی اقتدار اور عوام کو سیاسی حقوق دینے پر تیار ہو جائے۔

اب جب کہ ہمارے یہاں افہام و تفہیم کی کسی نمایاں کوشش کے بغیر حالات کے تقاضوں کے تحت فوجی حکومت تبدیلی لانے پر تیار ہو گئی ہے تو اگرچہ یہ تبدیلی سیاسی لیڈروں کے تصوراتی معیار سے بہت فروتر ہے اور اس کے لیے جو انتخابات منعقد ہو رہے ہیں وہ ان کے مطلوبہ و دل پسند نقشے سے ہٹ کر ہوں، اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کیونکہ

اسی صورت میں اختیارات و حقوق کا اچھا خاصہ حصہ قوم کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ پھر اگر زیرک اور مدبر لوگ معتدل اور متوازن ذہن سے آئندہ چند برس میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کام کریں اور اپنے آپ کو جماعتی اور گروہی تعصبات کی گرفت سے نکال کر عمومی انحاد پیدا کر کے اقدام کریں تو آہستہ آہستہ حاصل شدہ سرمایۂ اختیارات و حقوق کے بل پر مزید اختیارات و حقوق حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

اس وقت روٹھ کے بیٹھ رہنا یا انتخابات کا بائیکاٹ کرنا یا بائیکاٹ کو زبردستی کامیاب بنانے کے لیے تخریب کاری کے ذریعے عوام میں دہشت پھیلانا، بہ طریقِ انتخابات کے کھلتے ہوئے دروازے کو بند کرانے کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں دے سکتے۔ اس وقت ملک بعض دشمنوں کی زد میں ہونے کی وجہ سے ہنگاموں کا متحمل نہیں ہے۔ یہ وقت کسی بھی قسم کی تصادمی پالیسی کے لیے مناسب نہیں ہے۔

ہماری خواہش ہے کہ انتخابات بہتر سے بہتر نقشے پر ہوں اور اس نقشے کو زیادہ سے زیادہ خواص و عوام کی تائید حاصل ہو، مگر چاروناچار اگر معاملہ ہمارے پسندیدہ معیاروں سے کم درجے پر بھی رہے (بشرطیکہ اتنا نیچے نہ چلا جائے کہ جمہوری قبا میں دیوِ استبداد ہی کو رقص فرما ہو) تو ایسی صورت میں قوم کو انتخابی میدان میں ضرور آنا چاہیے۔

---

(۲)

اب مجھے چند باتیں ایسے تمام حضرات سے کہنی ہیں جو اسلامی مقاصد کے لیے انتخابات میں بہ حیثیت امیدوار یا بہ حیثیت ایجنٹ یا بہ حیثیت کارکن حصہ لینے والے ہوں، خواہ ان کا تعلق کسی بھی جماعت سے رہا ہو اور وہ کسی بھی لیڈر کے متوسلین میں سے ہوں، یا وہ محض آزاد فرد ہونے کی حیثیت سے آرہے ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو تنہائی میں جائے نماز پر بیٹھ کر خدا کے سامنے عاجزی کے انداز سے اپنے آپ کو اس عہد کے ساتھ پیش کرنا چاہیے کہ اے اللہ! تو گواہ رہ کہ میں

صرف تیرے دین کی اشاعت اور سربلندی کے لیے اس میدان میں جا رہا ہوں، میں پوری کوشش کروں گا کہ اگر مجھے موقع ملے تو اپنے دماغ اور زبان و قلم اور روابطِ انسانی کے ذریعے ہر اُس بات کو تقویت پہنچاؤں جو تیرے دین کے لیے مفید ہو اور ہر اُس بات کی مزاحمت کروں جو دین کے لیے مضر ہو۔ میں تجھے حاضر و ناظر جان کر اقرار کرتا ہوں کہ ہر کام عدل و دیانت سے کروں گا، ضمیر کے مطابق رائے دوں گا، اتحاد بین المسلمین کے لیے پوری کوشش کروں گا، عوام کے مصائب و مسائل کو پورے زور سے سامنے لاؤں گا، ہر اُس شخص کی حمایت کروں گا جو ان اُمور میں صحیح رویہ اختیار کرتے ہوئے کوئی بات کرے، خواہ وہ کسی بھی طبقے یا گروہ کا آدمی ہو، اور ہر اُس شخص کی مخالفت کروں گا جو متذکرہ دیانت دارانہ رویے سے ہٹ کر چلے۔ میں یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ پورے ملک اور اس کے ہر صوبے اور ہر طبقے اور ہر ادارے کی بہبود کے لیے یکساں جذبے سے کام کروں گا۔ میں تجھ سے اس بات پر خصوصی مدد چاہتا ہوں کہ میں کبھی اپنے ذاتی مفاد یا اپنے اعزہ و اقربا کی ناجائز خدمات کے چکر میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اے اللہ! تو ہی مجھے اپنے عہد اور اس صحیح اسلامی نقطۂ نظر پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما۔

ہو سکے تو اس عہد کو بعض اہم مجالس میں پڑھ کر سنا بھی دیا جائے تاکہ اس پر کثیر لوگوں کی گواہی ہو جائے۔

دوسرا ضروری امر یہ ہے کہ اسلام میں اُمیدواری اصلاً ہی شاذ و نادر صورتوں کے قلیل استثنا کے ساتھ، ناجائز ہے۔ لہٰذا کوئی خادمِ دین فردانہ خود اُمیدوار بن کر کھڑا نہ ہو، بلکہ اگر ملنے والے بالعموم اس سے تقاضا کریں تو یا تو اس کے حلقے کے سابق بزرگ مناسب تعداد میں اُسے شرکتِ انتخاب کی اجازت دیں، یا وہ اپنے حلقے کے اہم اہلِ دین و دانش کو جو سیاسی شعور کے ساتھ اسلامی کردار بھی رکھتے ہوں، مناسب تعداد میں جمع کرے اور ان سے پوچھے کہ ان کی رائے میں دین اور ملک و قوم کے لیے میری خدمات مفید ہو سکتی ہیں یا نہیں، اس سوال کا

بے لاگ جواب دیں۔ اگر ان کا معتد بہ اجتماع (مثلاً ۵۰ افراد) بالاتفاق اس کے حق میں فیصلہ دے دے تو وہ آگے بڑھے، ورنہ رک جائے۔

اُمیدواری سے اجتناب کے معنی یہ بھی ہیں کہ کوئی شخص اپنے متعلق یہ آرزو نہ رکھتا ہو کہ اُسے نمائندگی کا منصب ضرور ملے۔ وہ اس کے لیے خاص کوشش نہ کرے۔ جوڑ توڑ نہ کرے۔ حامی اور حمایتی جمع نہ کرے، اپنا گروپ نہ بنائے اور کسی دوسرے ہم خیال کا حریف بن کر سامنے نہ آئے۔ یہ طریقے دین کی خدمت کرنے والوں کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ بصورت دیگر انتخابات خادمانِ دین کی صف کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ ایسی روش اختیار کرنے والوں کے ذریعے کوئی خدمتِ دین نہیں ہوسکتی، اُلٹا وہ اقامتِ دین کی راہ میں مشکلات پیدا کریں گے۔

تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ انتخابی عمل (اور اس کے بعد پارلیمانی سرگرمیوں) کو دعوتِ اسلامی کے فروغ کا ذریعہ بنایا جائے۔ ہمارے ملک میں چونکہ نفاذِ اسلام کا کسی نہ کسی شکل میں دھیما سا آغاز ہوچکا ہے اس لیے یہاں کسی سیکولر ملک کے مقابلے میں دعوتِ اسلامی کے زیادہ مواقع ہیں۔ فروغِ اسلام چاہنے والے کسی بھی اُمیدوار کو یہ اُصولی حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انتخابات جہاں تبدیلیِ اقتدار اور قوم کے نمائندوں کے تعین کا ذریعہ ہیں وہاں وہ دعوتِ اسلامی کے فروغ کا بھی ذریعہ ہیں۔ جیت ہو یا ہار، دونوں صورتوں میں یہ کام اگر اچھی طرح کرلیا جائے اور عوام، خصوصاً تعلیم یافتہ افراد اور نوجوانوں میں سے اہلِ سعادت کو خدا اور رسولؐ کے قریب کردیا جائے تو پھر سمجھیے کہ انتخابی کشمکش میں فتح ہی فتح ہے ــــ کیونکہ جیت بھی اپنی ہے اور ہار بھی اپنی! دعوت کے کھیل میں کبھی ہار نہیں ہوتی۔

اس کام کے لیے تقاریر، گفتگوؤں، پوسٹروں اور منشور کے مؤثر مواد کے ساتھ اعلیٰ و درخشاں اسلامی اخلاق کا عملی مظاہرہ ہو تو بڑے قیمتی نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

چوتھا مشورہ میں یہ دینا چاہتا ہوں کہ انتخابات کو ایک دنیوی سرگرمی نہ سمجھا جائے بلکہ ایک دینی خدمت سمجھ کر ان میں حصہ لیا جائے۔ سیاسی میدان میں انتخابی رسہ کشی دولتِ دنیا کی مسابقت کی طرح ذہنوں پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ دینی جذبات بالکل نہ نشین ہو جاتے ہیں۔ محبت دین کو انتخابی مسابقت میں کارفرما رکھنے کے لیے تعلق باللہ ضروری ہے اور عام حالات خدا تعالیٰ سے وابستگی رکھنے کے لیے جتنی کوشش کی جاتی ہے، انتخابات میں اس سے کہیں بڑھ کر کوشش کی ضرورت ہے۔

بہتر یہ ہے کہ انتخابی جدوجہد کے لیے صبح دم گھر سے نکلتے ہوئے نفل پڑھ کر اور دعا مانگ کر نکلا جائے، اِدھر اُدھر آتے جاتے جہاں موقع ملے، مناسب قسم کا ذکر سِری جاری رکھا جائے، پھر جب کام ختم کر کے واپسی ہو تو سونے سے پہلے پھر خدا کے سامنے پیش ہو کر اس کی مہربانیوں کا شکر بھی ادا کیا جائے اور دن بھر کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا خود ہی احتساب کر کے عفو طلبی کی جائے۔ مجالس اور تقاریر اور مشاورتوں کے آغاز و اختتام پر پُرسوز الفاظ میں (خواہ مختصر ہوں) تہ دل سے دعائیں کی جائیں۔

یہ اہتمام اگر نہ کیا جائے تو سیلِ انتخابات کی موجوں کی کشاکش آدمی کو ایسے ایسے بھنوروں میں ڈالتی ہے کہ خدا کو تو کیا یاد کرے گا، اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔

پانچویں چیز جو کسی بھی سچے خادمِ اسلام کے لیے ضروری ہے وہ بدعنوانیوں MAL-PRACTICES سے بچنے کا اہتمام ہے۔ جھوٹ بول کر، وعدہ خلافی کر کے، اخلاقی ضابطوں کو توڑ کر، رشوت دے کر، جاہلی عصبیتوں کو چیلوں، بہانوں سے استعمال کر کے، جعلی ووٹ بھگتا کر، فرقہ وارانہ اشتعال پیدا کر کے، حریفوں پر بے جا قسم کی گندگی اچھال کر، مغالطے پیدا کر کے، کردار کشی کر کے اگر کچھ زیادہ ووٹ لے بھی لیے تو اس کامیابی کو مشکل ہی سے خدمتِ دین قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی خدمت صرف اسلامی کردار کے ساتھ ہی ادا کی جا سکتی ہے۔

کچھ لوگ یوں سوچا کرتے ہیں کہ ایک بڑے معرکے میں تھوڑی سی گڑبڑ کر [illegible]

ہم پھر اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئیں گے۔ عملاً ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ایک بار کسی فرد یا گروہ کو جس رویّے کی چاٹ لگ جاتی ہے، پھر اُسے دہرائے بغیر نہیں رہتا۔ اُس نے ایک بار نفس کو جو ڈھیل دی تھی، اس کی وجہ سے اس کا نفس اس کی رسی سے زیادہ طاقت ور ہو جاتا ہے۔ اخلاقی پابندیاں تو برسوں کی تربیت سے بہ مشکل پیدا ہوتی ہیں، بصد مشکل قائم رہتی ہیں، لیکن ان پابندیوں کو اگر ایک بار توڑ دیا جائے تو پھر گویا برسوں کی تربیت سے جو عمارت بنی تھی وہ کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ اُسے سیم اور کلر لگ جاتا ہے۔ ہر ڈھیل کے بعد ایک نئے اضطراری جواز کا راستہ کھلتا ہے۔ پھر ایک قدم اور، پھر چار قدم اور! وہی بات کہ "صد سالہ را ہم دُور شد"

اسلامی مزاج کے لوگوں کو تو تاریخی تجربات کو سامنے رکھ کر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ انتخابات ان کے نصب العین کے مکمل طور پر حصول کا ذریعہ ہو ہی نہیں سکتے۔ بالآخر ان کو کچھ اور ہی مراحل سے گذرنا ہوگا۔ انتخابات تو اصلاً ذریعۂ اثر اندازی ہیں — ووٹروں اور عوام میں بھی، پارلیمانی ایوان میں بھی، دوسرے سیاسی عناصر میں بھی۔ لہٰذا انتخابات یہ معنی نہیں رکھتے کہ بس یہ آخری معرکہ ہیں۔ لہٰذا جو کچھ بھی ضرورت پیش آئے، کر گزرو۔ اس قسم کی غلط فہمی سے اپنے دلوں کو بالاتر رکھیے۔

چھٹے نمبر پر میری گذارش یہ ہے کہ ایک تو ہوائی قسم کے بڑے بول نہ بولیے کہ ہم آگئے تو دُنیا تہ و بالا کر دیں گے اور زندگی جنت بن جائے گی۔ اور اسلام کے سوا یہاں کچھ نہ رہے گا۔ بجائے ایسی باتوں کے معتدل انداز سے بتلایئے کہ آپ کے سامنے موجودہ مرحلے میں کن تبدیلیوں کا نقشہ ہے اور آپ اگر دوسرے لوگوں کے ساتھ کسی متفقہ پروگرام پر جمع ہو سکے تو کیا کر سکیں گے اور اپوزیشن میں رہے تو آپ کس طرح اثر انداز ہوں گے۔

دوسری بات اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہر عزیز ووٹر کے سطحی ذہن سے نہ سوچیے کہ اس کے اندر جو جو خواہشات پائی جاتی ہیں یا جن جن باتوں سے وہ خوش ہو سکتا ہے وہ اپنے پچھلے ریکارڈ اور بعد کی ذمہ داریوں کو زیر نظر رکھے بغیر کہہ دی جائیں۔ دوسرے حریفوں

کے ساتھ آپ بھی ووٹوں کی نیلام مارکیٹ میں بولی دینے کھڑے ہو جائیں اور دوسروں کی طرح بڑھتی چڑھتی بولی لگاتے چلے جائیں۔ یہ طریقہ پیپلز پارٹی نے پورے مبالغے سے استعمال کر کے تمام حریفوں کو زک دی اور ووٹروں کو مسحور کر لیا، لیکن بعد میں روٹی، کپڑا، مکان کے نعروں کا کھوکھلا پن جب آشکارا ہوا تو پارٹی کا سارا وقار ختم ہو گیا اور عوام نے قومی اتحاد کے ساتھ مل کر اس کا تخت اُلٹ دیا۔ اول تو یہ بے سروپا طریقہ ہر کوئی اختیار نہیں کر سکتا کہ مکانوں اور دکانوں کے کرایہ دار مالک ہو جائیں گے۔ رکشا چلانے والے ڈرائیوروں کو رکشاؤں کی ملکیت دے دی جائے گی، ہر شخص کو ساڑھے بارہ ایکڑ زمین فراہم کر دی جائے گی۔ وھلم جرا۔ پھر اگر کوئی اختیار کر بھی تو وہ بھٹو صاحب کی طراری کے ساتھ ان کی سی اسراریت کو مارشل لا کی تلوار کے ساتھ جمع کر کے ویسی کامیابی حاصل کرنے سے رہا۔ اور کامیابی حاصل کر بھی لے تو وہ صرف ایک بار کے لیے ہوگی۔ آگے کے لیے دروازہ بند ہو جائے گا۔

اسلام کے خادموں کو ووٹر کی ضروریات، تکالیف اور مسائل کا خیال ضرور رکھنا چاہیے اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں ان کے حل پیش کرنے چاہییں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ووٹر کو ایجوکیٹ کرنے کی خدمت بھی انجام دینی چاہیے۔ خصوصیت سے اس کی انتخابی سوچ کو اسلامی طرز پر ڈھالنا چاہیے۔ ورنہ اس کی سوچ اگر غلط رہی تو کسی شخص یا گروہ کی وقتی کامیابی کوئی بڑی چیز نہیں ہے، اسے ووٹر کی غلط سوچ بار بار پریشان کرے گی۔

کم از کم مسلم ووٹروں کو (جو اکثریت میں ہیں) احساس دلانا ہے کہ تم مسلمان ہو، تمہارا سوچنے کا انداز ایسا اور ایسا ہونا چاہیے، تمہیں خلافِ اسلام چیزوں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے، غلط اشخاص کی ساحری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے ذاتی اور محدود مفاد کو معیار نہیں بنانا چاہیے، نہیں اپنے نمائندے چُنتے ہوئے ان کی قابلیت، دیانت، ان کے کردار اور اسلامی خدمات کو دیکھنا چاہیے۔ ہمارے ووٹر میں جب تک یہ بنیادی تبدیلی نہیں آئے گی، اسلام کے لیے جمہوری راستے سے اُبھرنا ممکن نہیں ہوگا ــــ اور اس تبدیلی کی تلقین جتنی مؤثر انتخابی فضا میں ہو سکتی ہے، اتنی عام حالات میں نہیں ہوتی۔ بلکہ عام حالات

میں سیاسی لوگ بھی شہریوں کو ووٹر کی حیثیت سے نہ خطاب کرتے ہیں اور نہ اُن کی تربیت کرتے ہیں۔

اسلامی مقاصد کے لیے کام کرنے والوں کو بہرحال ووٹر کی خودغرضانہ اور مفاد پرستانہ ذہنیت کی ہوا میں مرغِ بادنما نہیں بن جانا چاہیے۔ کسی کو کہا جائے کہ تمہارے لڑکے کو نوکری دلادیں گے، کسی سے وعدہ کیا جائے کہ تمہارے بھائی کو مقدمے سے چھڑا دیں گے یا پھانسی کے تختے سے اُتروا لائیں گے، یا یہ کہ مزدوروں سے کہا جائے کہ تمہاری تنخواہ دو ہزار روپے مقرر کرادیں گے وغیرہ۔

اس ذہنیت کے ساتھ کبھی کوئی صحیح منشور یا خاکۂ منشور نہیں بن سکتا۔ لہٰذا آنکھوں کے اوپر پٹی باندھ کر ووٹر کا بازو تھام کے اس کے پیچھے نہیں چلا جا سکتا۔

آپ کو ووٹر کا خادم اور خیر خواہ ہونے کے ساتھ اس کے لیے بہترین معلم و مشیر بھی ہونا چاہیے۔ یہی بہت بڑی خدمت اور خیرخواہی ہے۔

خیال یہ بھی رہے کہ کسی بھی اُمیدوار کے اصل ووٹر وہ ہیں جن کے اندر پہلے سے کام کیا گیا ہو، جن میں برسوں سے دعوتِ خیر و فلاح پہنچائی جاتی رہی ہو، جن کی تکالیف کے ازالے کے لیے تگ و دَو کی جاتی رہی ہو، جن کے ساتھ معروف طریقوں سے رابطہ رکھا گیا ہو اور جن کو اچھے نظریات اور مقاصد کی طرف توجہ دلائی جاتی رہی ہو۔ وقتی طور پر ساتھ دینے والے ووٹر اگر بہت زیادہ بھی ہوں تو وہ اتنے ہوں گے جتنے پہلے کے شناسا اور متعلق ووٹر ——— یا اُن سے دُگنے سمجھ لیجیے۔ مگر یہ خیال کرنا کہ اچھی تقاریر یا زوردار منشور یا دلکش پوسٹر اور ووٹروں کے لیے پسندیدہ سلوگن، ووٹروں کا ایک سیلاب آپ کی طرف بہا لے آئیں گے، کچھ زیادہ صحیح اندازہ نہیں ہے۔ اب اگر ماضی میں کیے ہوئے کام میں کوتاہی رہ گئی ہے تو اس کی تلافی دلفریب نعروں اور مسحورکن وعدوں سے تو نہیں ہو سکتی لہٰذا وقتی پروگرام کی اہمیت بہت زیادہ نہیں ہے۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ پروگرام ہونا ضرور چاہیے۔ پروگرام جو بھی ہو، اُسے دیانت داری سے نظریات اور حقائق کی بنیادوں پر

مرتب کرنا چاہیے۔ نہ یہ کہ وہ ووٹوں کی صیادی کے لیے لاسے کے طور پر۔[۱]

اس وقت کے احوال میں (اور مستقلاً بھی)، ایک سہ کلماتی سلوگن کافی ہے۔ میں ہر محبِ اسلام اُمیدوار کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اسے قبول کرے، خواہ وہ کسی بھی دائرے سے تعلق رکھتا ہو۔ آج قوم کو جن تین چیزوں کی ضرورت ہے وہ ہیں:

۱- ایمان ۲- امن ۳- انصاف

اِن تین اُصولی ضرورتوں کے زیرعنوان ہمارے تمام مسائل کے حل آجاتے ہیں۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تمام ماحول ایسا بنایا جائے کہ جس میں ایمان نشوونما پاسکے اور جس میں ایمان سے ٹکرانے اور اسے ضرر پہنچانے والی چیزیں ختم ہو جائیں۔ نظامِ تعلیم کی رُوح

۱؎ میرے نقطۂ نظر سے موزوں ترین اُمیدوار وہ ہے جو اطمینان سے عوام کے سامنے آئے اور ان سے کہے کہ تم سب مجھے جانتے ہو، میری تعلیم سے آگاہ ہو، میرے اُصول و مقاصد تمھیں برسوں سے معلوم ہیں، میرے کردار سے تمھیں آگاہی ہے، میرے سیاسی پارٹ سے بھی، دینی خدمات سے بھی اور سماجی سطح پر میری خدمتِ خلق کی کوششوں سے بھی تم آشنا ہو، بس یہی کچھ میری متاع ہے، اسی سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ میں کیا کرنا چاہوں گا اور کیا نہیں، لہٰذا میں لمبے چوڑے دعووں اور وعدوں کے بغیر کہتا ہوں کہ اگر تم حلقے کے اُمیدواروں میں سے مجھے اچھا پاتے ہو تو مجھے ووٹ دو، اگر کسی دوسرے کو علم، دیانت اور خدمات کے لحاظ سے بلند تر پاتے ہو تو جاؤ اس کا ساتھ دو۔ کاش کہ پاکستان میں ایسے لوگ ہوں جو اس طرح پبلک میں آکر حمایت حاصل کر سکیں، مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ پیچھے اتنا تعارف، اتنا کام اور اتنا رسوخ موجود ہو کہ لوگ کھچے چلے آئیں۔ افسوس کہ اس طرح کے مقامی لیڈر اس ملک میں کم ہی پیدا ہو سکے۔ اس کے لیے جتنی پتّہ ماری کی ضرورت ہے، اتنی کرنے کو کوئی تیار نہیں۔

ایمان کی رُوح ہو۔ معاشرت و ثقافت اور فنونِ لطیفہ کے دائروں میں ہمارے ایمان سے متضاد جو چیزیں نمودار ہو کر بڑھ رہی ہیں ان کا خاتمہ کیا جائے۔ لٹریچر اور صحافت اور ذرائع ابلاغ کو ایمان پرور ہونا چاہیے۔

امن کے قیام کے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف قوم کو بیرونی حملوں کے خلاف اسبابِ تحفظ فراہم کر کے دیئے جائیں اور خود اس میں مضبوط جذبہ جہاد کی پرورش کے ساتھ خارجہ پالیسیوں اور دوستانہ معاہدات کے ذریعے ملت و وطن کی سلامتی کے سامان کیے جائیں، بلکہ اندرونِ ملک جرائم کا سدِ باب کرنے اور شہریوں کی جانوں، مالوں اور عزّتوں کی حفاظت کرنے کے لیے تمام ضروری اقدامات کیے جائیں۔ جرائم کے اسباب کا کھوج لگا کر ان کا قلع قمع کیا جائے۔ ذرائع ابلاغ کے جرائم آموز پروگراموں اور ذہنوں کو خراب کرنے والے لٹریچر اور گھٹیا فلموں کی روک تھام کی جائے۔ پولیس اور بیوروکریسی اور جاگیرداروں اور وڈیروں کی چیرہ دستیوں سے عوام کو بچانے کے لیے ایک جامع نقشۂ کار پر کام کیا جائے، رشوت اور خیانت اور روزمرّہ زندگی میں پائے جانے والے تشدّد کو روکا جائے، قانون شکنی کی وبائے عام کا توڑ کیا جائے جو بسوں اور رکشاؤں سے لے کر یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور ممتحنوں تک، اور عام مارکیٹوں سے لے کر وزیروں اور سفیروں کے دفتروں تک پھیلی ہوئی ہے۔

امن کے معنی یہ بھی ہیں کہ ایسے فتنۂ ہائے قلب و نظر کو فروغ کا موقع نہ دیا جائے جو نوجوانوں میں اسفل رجحانات کو اُبھار کر انہیں اخلاقی لحاظ سے کمزور کرتے اور غلط اقدامات کی طرف راغب کرتے ہیں۔ خواتین میں بے حجابی اور آرائشِ خد و خال کے ساتھ نمائشِ جمال کا بڑھتا ہوا چلن، بیرونِ خانہ ان کی روز افزوں چلت پھرت، مخلوط ثقافتی اور تفریحی مجالس، بیرونی وفود کا آکر یہاں رقص و سرود، عریانی، بے باکی اور دیگر لغو حرکات کے مظاہرے کرنا، یہ ساری چیزیں سفلی جذبات کو مسلسل بھڑکا کر کتنی ہی معصوم عورتوں اور بچیوں کی بربادیٔ عصمت کا سبب بن چکی ہیں۔ اب ہمارا ماحول ایسا ہے کہ ہم اپنے گھر میں بیٹھ کر بھی کانوں اور آنکھوں کو اُس زہر سے نہیں بچا سکتے جو غارت گرِ اخلاق ہے۔ یہ زہر آگے بڑھ کر دل و دماغ میں پہنچتا ہے اور فکر و احساس کا ستیاناس کر دیتا ہے۔

قوم کو خرکاروں سے بھی تحفظ کی ضرورت ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو بھاگ نکلنے والے بچوں کے دردناک قصوں پر بھی بیوروکریسی کے اساطین یا وزرا اور مشیروں میں سے کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا، یا پھر کسی کے پاس اتنی بصیرت نہیں کہ وہ تدارک کے لیے کوئی اسکیم وضع کر سکے[1]۔ روپیہ حاصل کرنے کے لیے انسانوں کا اغوا، عورتوں اور بچوں کے اندرونِ ملک ہی نہیں، باہر تک کے ٹریفک کو روکنے کی ضرورت ہے۔ تخریب کاروں کی زد سے اور ان کے خوف سے کاروباری اداروں، بنکوں، دفتروں اور سیاسی و سماجی شخصیتوں کے تحفظ کا انتظام کرنا چاہیے۔

حالتِ خوف سے قوم کو نکال لینے کا ہی نام امن ہے۔

اسی طرح انصاف کا مفہوم اتنا ہی نہیں کہ عدالتوں میں آسانی سے ہر شخص کو انصاف مل سکے، جلد مل سکے، اس کی راہ میں رشوت و سفارش کے علاوہ بھاری کورٹ فیسوں اور وکلا کے گراں بہا معاوضوں کی دیواریں حائل نہ ہوں، بلکہ انصاف کے اس سے بہت زیادہ وسیع مطالب ہیں۔

انصاف کے معنی یہ بھی ہیں کہ قومی زندگی، قومی دولت، قومی ملازمتوں، قوم کے رفاہی اداروں سے ہر شہری یکساں فائدہ اٹھا سکے اور کسی غریب آدمی کی غریبی اس میں حائل نہ ہو کر

(باقی بر صفحہ ۱۵)

---

[1] اپنے متعلق دعوے کرنا زیب نہیں دیتا، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے یقین دلایا جائے کہ کسی مناسب اسکیم پر دیانت داری سے عمل ہو گا تو میں بھی کوشش کر کے خرکاروں کے ظلم کے تدارک کا کوئی نقشہ تجویز کر سکتا ہوں۔ پھر یہاں مجھ سے ہزار درجے بہتر سوچنے والے یقیناً ہوں گے ان سے مدد لی جا سکتی ہے، لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ اس مسئلے پر نہ کوئی غور ہوا، نہ کوئی بورڈ بیٹھا، نہ اخبارات میں بحث ہوئی، نہ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر مذاکرے کرائے گئے اور نہ انتظامیہ اور پولیس کے افسران کی کوئی بڑی میٹنگ ہوئی۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اسلام کی اُمت ہر زمانے میں انسان کو دو ہی ذرائع سے پہنچی ہے - ایک اللہ کا کلام، دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں جن کو اللہ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ و تعلیم اور تفہیم کا واسطہ بنایا بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا تاکہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک ٹھیک منشا پورا کرنے کے لیے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیر صالح کر دکھائیں۔

یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ایسی لازم و ملزوم رہی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کسی سے الگ کر کے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہو سکا، اور نہ وہ ہدایت سے بہرہ یاب ہو سکا، کتاب کو نبی سے الگ کر دیجیے تو وہ ایک کشتی ہے۔ ناخدا کے بغیر، جسے لے کر اناڑی مسافر زندگی کے سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں، منزلِ مقصود پر کبھی نہیں پہنچ سکتے، اور نبی کو کتاب سے الگ کر دیجیے، تو خدا کا راستہ پانے کے بجائے آدمی ناخدا ہی کو خدا بنا بیٹھنے سے کبھی نہیں بچ سکتا - یہ دونوں ہی نتیجے پچھلی قومیں دیکھ چکی ہیں - ہندوؤں نے اپنے انبیاء کی سیرتوں کو گم کیا - اور صرف کتابیں لے کر بیٹھ گئے - انجام یہ ہوا کہ کتابیں ان کے لیے لفظی گورکھ دھندوں سے بڑھ کر کچھ نہ رہیں - حتیٰ کہ آخر کار خود انہیں بھی وہ گم کر بیٹھے - عیسائیوں نے کتاب کو نظر انداز کر کے نبی کا دامن پکڑا - اور اس کی شخصیت کے گرد گھومنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی چیز انہیں نبی اللہ کو ابن اللہ بلکہ عین اللہ بنانے سے باز نہ رکھ سکی۔

پرانے ادوار کی طرح اب اِس نئے دور میں بھی انسان کو نعمتِ اسلام میسر آنے کے وہی دو ذرائع ہیں جو ازل سے چلے آرہے ہیں، ایک خدا کا کلام جو اب صرف قرآنِ پاک کی صورت ہی میں مل سکتا ہے دوسرے اسوۂ نبوت جو اب صرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک ہی میں محفوظ ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور محمد صلی اللہ کو قرآن سے سمجھے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا۔ اس نے اسلام کو سمجھا۔ ورنہ فہم دین سے بھی محروم رہا اور نتیجتاً ہدایت سے بھی۔

پھر، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں چونکہ ایک مشن رکھتے ہیں ایک مقصد و مدعا کو لیے ہوئے آئے ہیں، اس لیے ان کو سمجھنے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ان کے مشن اور مقصد و مدعا کو کس حد تک سمجھتے ہیں اس چیز کو نظر انداز کر کے دیکھیے تو قرآن عبارتوں کا ایک ذخیرہ اور سیرتِ پاک واقعات و حوادث کا ایک مجموعہ ہے، آپ لغت اور روایات اور علمی تحقیق و کاوش کی مدد سے تفسیروں کے انبار لگا سکتے ہیں اور تاریخی تحقیق کا کمال دکھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے عہد کے متعلق صحیح ترین اور وسیع ترین معلومات کے ڈھیر لگا سکتے ہیں، مگر روحِ دین تک نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ وہ عبارات اور واقعات سے نہیں بلکہ اس مقصد سے وابستہ ہے جس کے لیے قرآن اُتارا گیا اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی علمبرداری کے لیے کھڑا کیا گیا۔ اصل مقصد کا تصور جتنا صحیح ہوگا، اتنا ہی قرآن اور سیرت کا فہم صحیح، اور جتنا وہ ناقص ہوگا، اتنا ہی ان دونوں کا فہم ناقص رہے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دونوں ہی بحرِ ناپیدا کنار ہیں۔ کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کرے تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جس چیز کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی ان کا زیادہ سے زیادہ صحیح فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے روحِ دین تک رسائی پائے۔ (دیباچہ محسنِ انسانیت)

(محمد یوسف صاحب ناظم لائبریری)

تقدیسِ علم کی ضرورت

پروفیسر محمد سلیم صاحب

اللہ کی طرف سے نازل شدہ آخری ہدایت اسلام ہے۔ انسانی زندگی کی فلاح وبہبود کی واحد ضمانت اسلام ہے۔ اسلام کے باہر زندگی بسر کرنے کے تمام طریقے گمراہی ہیں اور جاہلیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "پھر حق (اسلام) کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر تم کدھر پھرائے جارہے ہو" (یونس۔ ۳۲) جہاں خدا پرستی نہیں ہوتی وہاں ضرور غیر اللہ پرستی ہوگی۔ غیر اللہ پرستی خواہ کسی شکل میں ظاہر ہو دراصل وہ انسان پرستی ہوتی ہے۔ انسان پرستی کو خواہ کتنے ہی خوبصورت الفاظ میں پیش کیا جائے وہ درحقیقت خود پرستی اور خود غرضی کا ہی پرتو ہوتا ہے۔ خود پرستی اور خود غرضی گمراہی کے سوا اور کیا ہے! قرآن مجید کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ جاہلیت کی زندگی عالمِ انسانیت کے لئے تباہی کا پیش خیمہ ہے اور اسلامی زندگی عالمِ انسانیت کے لئے فوز و فلاح کا ذریعہ ہے۔

انسان پرستی میں زندگی گذارنے کے لئے انفرادی عقل کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ انسان خود مکتفی ہونے کا دعوے دار بن جاتا ہے۔ انسان انا ولا غیری کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ دنیا میں ساری خرابیوں، ساری زیادتیوں اور سارے مظالم کی حقیقت رسی کی جائے تو ان مفاسد کی جڑ انسان کی گمراہ ذہنیت میں پنہاں ہے۔ انسان اپنے دائرہ کار سے اور اپنی حقیقت سے تجاوز کر جاتا ہے۔ بندہ بن کر مقامِ بندگی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ خدا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ الوہیت کی قبا زیبِ تن کر لیتا ہے۔ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کا خدا بن کر ان پر

حکومت کرتا ہے۔ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنالیتا ہے۔ غلامی بہرحال انسانیت کی تذلیل ہے خواہ قدیم زمانہ کی محسوس غلامی ہو یا جدید دور کی غیر محسوس غلامی، وہ خود کو دوسرے انسانوں کا مالک، حاکم، قانون ساز اور حکمران بن جاتا ہے۔ دوسرے تمام انسان اس کے سامنے جواب دہ ہیں مگر وہ خود کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔ دوسرے تمام انسانوں پر وہ اپنا قانون اور سزا نافذ کرتا ہے مگر اس پر کوئی قانون اور سزا نافذ نہیں کرتا۔ الوہیت کا جامہ زیب تن کرنے والا کبھی ایک فرد ہوتا ہے اور کبھی ایک گروہ۔

اپنے جیسے انسانوں کی حاکمیت کو انسان بالطبع ناپسند کرتا ہے۔ اس لئے جس میدان میں اور جس درجہ میں جب کوئی فرد محسوس کرتا ہے کہ میں طاقتور ہوں وہ ماتحتی قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ بغاوت کے شستہ اور غیر شائستہ بہت سے طریقے ہیں۔ قتل اور ڈاکہ بھی درحقیقت بغاوت ہے اور انسانی قانون کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ بتدریج معاشرہ میں ہر قسم کے مظالم پیدا ہو جاتے ہیں، شر و فساد، ظلم و عدوان اور بدبینی و بدعملی سارے عالم کو گھیر لیتی ہے۔

ان حالات میں سب سے مشکل مرحلہ اصلاحِ حال اور خیرخواہی کے نقطۂ نظر سے یہ ہوتا ہے کہ کہاں سے آغاز کیا جائے، کس خرابی کو چھیڑا جائے اور کس کو چھوڑ دیا جائے۔ جسی نگاہ رکھنے والا انسان عام طور پر چند ایک ظاہری برائیوں پر توجہ مرکوز کر دیتا ہے گہرائیوں میں اس کی نظر جاتی ہی نہیں۔ برائیوں کی جڑ بدستور باقی رہ جاتی ہے۔ ظاہری طور پر تھوڑی بہت اصلاح ہو جاتی ہے مگر اصل برائیاں بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہیں، البتہ اللہ کے فرستادہ نبیوں کی نگاہ حقیقت بیں ہوتی ہے۔ وہ برائی کی اصل جگہ اور جڑ پر تیشہ زنی کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی اصلاح کامیاب اور دیرپا ہوتی ہے۔

انبیاءِ اکرام کے طریقۂ کار پر گفتگو کرنے سے قبل ایک حقیقت کا اظہار کرنا ضروری ہے۔ تحلیل نفسی کے جدید مغربی ماہرین فرائڈ، میک ڈیگرٹ اور برگسان وغیرہ خواہ کچھ بھی دعویٰ کرتے رہیں یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ انسانی زندگی میں اوّل درجہ علم کا ہے، اس کے بعد عمل کا نمبر آتا ہے۔ جبلتوں کا دائرہ انسانی زندگی میں نہایت محدود ہے اور وہ بھی انسان کے ارادہ کی

نزدیک سے مادری نہیں ہے ۔ اس لئے انبیاءِ اکرام اصلاحِ کار کا آغاز علم کی تطہیر اور تقدیس سے کرتے ہیں ۔ افکار کی اصلاح کے بعد اعمال کی اصلاح کا راستہ آسان ہو جاتا ہے ۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر وحی الٰہی کے طریقِ ہدایت میں اولین اہمیت علم کو حاصل ہے، مگر نہ محض علم کا حصول کافی ہے اور نہ ہر قسم کے علوم کا درجہ برابر ہے ۔ رسول اللہ پر سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی وہ یہ ہے "پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے (علق ۱)۔ اس پہلی وحی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور رسول کے توسط سے امت مسلمہ کو اور عالمِ انسانیت کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے ۔ اس اولین حکم میں یہ بات عیاں ہو گئی کہ انسانی زندگی میں اولین اہمیت علم کو حاصل ہے، معاشرہ میں اصلاحِ کار کا آغاز حصولِ علم سے ہونا چاہیے ۔ علم کے بغیر کوئی شخص راہِ ہدایت نہیں پا سکتا، مگر مجرد علم کا حصول کافی نہیں ہے ۔ یہاں وحیٔ الٰہی نے ایک نہایت اہم شرط کا اضافہ کیا ہے ۔ جس سے علم کی تقدیس اور رفعت کا طریقہ کار معلوم ہو جاتا ہے ۔ اس شرط کا مطلب یہ ہے کہ ایک علم وہ ہے جو اللہ کے نام کے ساتھ حاصل کیا جاتا ہے اور دوسرا علم وہ ہے جو اللہ کے نام کے بغیر حاصل کیا جاتا ہے جو نفس کے نام پر حاصل کیا جاتا ہے ۔ جو قوم پرستی اور وطن پرستی کے نام پر حاصل کیا جاتا ہے ۔ جو اپنے جیسے انسانوں پر غلبہ اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے ۔ بہرحال جو علم غیر اللہ کے نام پر حاصل کیا جاتا ہے وہ انسان کے دردوں کا مداوا نہیں ہو سکتا ۔ اس علم میں انسان کتنی ہی ترقی کر جائے وہ بدستور گمراہی پر گامزنی کرتا رہے گا ۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

اس کے برخلاف ایک علم وہ ہے جو اللہ کی عظمت اور کبریائی کے لیے حاصل کیا جاتا ہے ۔ اس سے انسان مادیت کی پستی سے نکل کر روحانی رفعت حاصل کر لیتا ہے ۔ اس علم سے خود غرضی اور ہوس پرستی سے نگاہیں بلند ہو کر مثالِ اعلیٰ پر مرکوز ہو جاتی ہیں ۔ اس علم سے اخلاق و کردار میں رفعت اور پاکیزگی پیدا ہوتی ہے ۔ اس علم سے انسان میں نگاہِ بلند

سخنِ دلنواز، جانِ پُرسوز، پیدا ہو جاتی ہے۔

اِس طرح وحی الٰہی نے علم کا قبلہ درست کر دیا۔ یہ علم و آگہی کی تاریخ میں عظیم الشان اصلاح ہے۔ یہ بنیادی اصلاح ہے۔ وحیِ الٰہی نے انسانی خرابیوں کی صحیح تشخیص کی ہے۔ افسوس مسلمانوں نے اس تشخیص کی صحیح قدر و قیمت نہیں جانی۔ صحیح علم بس وہی ہے جس کا قبلہ عظمت الٰہ ہوا ور تقدیس الٰہ ہو جس کے پڑھنے سے انسان کے اندر حسنِ اخلاق، حسنِ کردار خلوص اور للّٰہیت پیدا ہوتی ہے۔ ایسے بلند اخلاق اور بلند کردار لوگ انسانی معاشرہ کا گُل ہوتے ہیں۔ اسلام ایسے ہی مہذّب، شائستہ اور با اخلاق افراد پر مشتمل ایک فلاحی اور خیر خواہ معاشرہ تشکیل دیتا ہے۔ ایسے لوگ اسلامی اخلاق اور اسلامی حیات کے بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ تمام علوم و فنون جن میں عظمتِ خداوندی اور تقدیس اللہ کی رُوح سرایت کیے ہوئے ہو وہ سب عالمِ انسانیت کے حق میں نعمت ہیں اور رحمت ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دوسری وحی جو نازل ہوئی وہ یہ ہے۔ "اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اٹھو اور خبردار کرو۔ اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔ (مدثر ۱)

اس دوسری وحی نے رسول اللہ کو حکم دیا کہ وہ عام انسانوں کو ان کے اعمال کے نتائج بد سے ڈرائیں اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کا بیانگِ دہل اعلان کریں۔ خدائی کے دعویدار دوسرے معبودوں کے ساتھ کسی قسم کی مداہنت اور رعایت نہ برتیں۔ اس حکم کے ملنے کے بعد اللہ کے رسولؐ نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت، تقدس و احترام کا نعرہ اس زور شور سے لگایا کہ اس کے بعد پھر کسی بد خود غلط انسان کے لیے غیر اللہ پرستی کی گنجائش کم ہی رہی۔ پھر خدا بننے اور طاغوت بننے کا موقع نہ رہا۔ سب کی خدائی خاک میں مل گئی۔ سارے طاغوت سرنگوں کر دیے گئے۔ اس حقیقتِ کبریٰ کا اعتراف ہماری دینی روایات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے بعد بت اوندھے منہ گر پڑے۔ آتش کدوں کی آگ سرد پڑ گئی۔ ایوانِ کسریٰ کے کنگرے ٹوٹ کر گر پڑے —— طاغوت پرستی کے خلاف اس اعلانِ حق کے اثرات ختم نہیں ہوئے۔ وہ بعد میں بھی جاری

رہے۔ جب شنکر اچاریہ نے جنوبی ہندوستان میں "مورتی کھنڈت" کی مہم چلائی تو در اصل یہ نبی عربی کے آوازہ حق کی صدائے بازگشت تھی۔ جب مارٹن لوتھر نے پوپ کے خلاف ۹۵ نکات پر مشتمل فردِ جرم عاید کی تھی تو یہ تعلیمات محمدی کا ہی فیضان تھا۔ قرآن مجید کا لاطینی ترجمہ پڑھ کر اس نے یہ مہم جاری کی تھی۔

عظمت خداوندی اور تقدیسِ خداوندی اسلام کے ہر رکن سے ظاہر ہے۔ نماز کا آغاز اذان سے ہوتا ہے۔ اذان میں چار مرتبہ اللہ اکبر کا معنی خیز نعرہ ہر مسجد سے بلند کیا جاتا ہے۔ دن رات میں پانچ مرتبہ اذان دی جاتی ہے۔ اس طرح بار بار یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ عظمت و کبریائی کی مستحق صرف اللہ وحدہٗ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ انسان ذات کو بھولے سے بھی حریم الوہیت ـــــ علو و جلال و کبریائی ـــــ میں قدم نہیں رکھنا چاہیے ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

یہ نعرہ یاد دلاتا ہے کہ اے انسان نادان! طاغوت نہ بن، بندہ بن کر رہ!

اللہ اکبر کے مختصر سے جملے کی تفصیل کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے، جس میں طاغوت کے انکار، اللہ پر ایمان اور راہِ ہدایت کے لیے سنّتِ محمدی کی اطاعت کی دعوت دی گئی ہے۔ جب تک غیر اللہ کا انکار نہ کیا جائے، اس وقت تک دل کی سرزمین میں ایمان کا بیج نہیں پھوٹ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لائے، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں"۔ (البقرہ - ۱۵۶)

آفاق میں اک نعرۂ تکبیر لگا دو
طاغوت کے ایوانوں کی بنیاد ہلا دو

انوارِ حرمین

جناب خلیل حامدی صاحب

سعودی عرب کی سپریم جوڈیشل کونسل کی طرف سے آج یہ اعلان کردیا گیا کہ آئندہ واے منگل کو (یعنی ۴ ستمبر ۱۹۸۴ء) وقوفِ عرفہ ہوگا۔ چونکہ ایامِ حج قریب آگئے ہیں اس لیے حاجیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ حرم شریف میں داخل ہوں تو عجیب پُرکیف مناظر کی جھلک ملتی ہے ...... بیت اللہ کے گرد طواف کرنے والوں کا غیر معمولی ہجوم ہے۔ عشاق سب تابانہ محوِ گردش ہیں۔ دُعاؤں اور نالوں سے صحنِ حرم گونج رہا ہے۔ آنسوؤں نے غلافِ کعبہ کو تر کر رکھا ہے۔ میزابِ رحمت کے نیچے نفل گزارنے کے لیے ہر کوئی مضطرب ہے، مگر باری بمشکل نصیب ہوتی ہے۔ حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے دلوں کی بے قراری اور روح کی سیماب وشی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ لاکھ اژدحام ہو، خواہ کتنے ہی کندھے چھلیں اور ہجوم کا دباؤ کتنا ہی جان لیوا ہو اہلِ عزم ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ مقامِ ابراہیم پر دوگانہ ادا کرنا ناممکن ہو رہا ہے کیوں کہ اب یہاں تک طواف کرنے والے پھیل چکے ہیں، چنانچہ حرم میں جہاں بھی دوگانہ طواف ادا کر لیا جائے درست ہے۔ اس کے لیے کسی مخصوص مقام کی شرط نہیں ہے۔ اُدھر مسعیٰ پر نظر دوڑائیں تو از صفا تا مروہ دونوں سمتیں آنے اور جانے والوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہیں۔ اب سعی کے سات شوط پورے کرنے کے لیے کافی وقت چاہیے۔ یہاں بھی مردوں اور عورتوں کی دلگدازدُعاؤں اور تکبیر و تہلیل و ثنا سے لبریز صداؤں سے فضا میں ارتعاش ہے۔ حرم کے گوشے گوشے سے بندگانِ خدا و غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سجدوں اور صداؤں دراشکوں

اور آہوں کا سیلاب اُمڈ رہا ہے۔

یہ افریقہ کے تکرونیوں کی جماعت جا رہی ہے۔ مرد و زن سب سیاہ فام، سادگی و بدویت ہر گام سے عیاں۔ اشکبار آنکھوں کے ساتھ ہاؤ ہو کرتی ہوئی بیت اللہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ افریقہ کے دُور دراز حصوں سے سفر کرتی ہوئی آج مرکزِ شوق تک پہنچ چکی ہے۔ اُدھر سیکڑوں افراد پر مشتمل ترکوں کی ٹولی باب الملک عبدالعزیز سے حرمِ خداوندی میں قدم رکھ رہی ہے۔ سُرخ و سپید رنگ ہیں، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی۔ مردوں کا احرام بھی اور عورتوں کا لباس بھی سفید ہے۔ آگے آگے ایک ترک عالم مناسک کے بارے میں رہنمائی کر رہے ہیں۔ چہروں سے جذب و شوق کی لہریں بے محابا اُمڈ رہی ہیں۔ آج اُن کے ہر فرد کی زندگی کی آرزو پوری ہو رہی ہے۔ دھیمے انداز میں کشاں کشاں کعبے کے اُس کونے کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں سے طواف کا آغاز ہوگا۔ برآمدے میں انڈونیشی حاجی بیٹھے ذکر و تلاوت میں مصروف ہیں۔ مرنجان مرنج طبیعت اُن کا امتیازی وصف ہے۔ مصر و شام سے بھی بکثرت لوگ پہنچ چکے ہیں۔ حرم کے جس حصے میں بھی جائیں یہ نماز پڑھتے، تلاوتِ قرآن کرتے اور تسبیح و تکبیر کرتے ملیں گے۔ اب لیجیے پاکستان کے حاجی حضرات کو یعنی حرمِ خداوندی کے آداب و ضوابط سے ناآشنا قوم۔ یہ حرم کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ جوانوں کا تناسب زیادہ ہے۔ طواف میں بھی ان کی اکثریت ہے۔ ضمنی عمروں میں بھی یہ بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ حرم کے درسوں سے بھی استفادے میں پیچھے نہیں ہیں۔ البتہ سیاسی گروہی اختلاف، اصولوں کو چھوڑ کر فروع پر اصرار کا جذبہ اور افواہوں کی اشاعت کا ذوق ان میں عام ہے۔ امریکہ اور یورپ کے نومسلم حاجی بھی مادیت سے بیزار کیفیتوں کے ساتھ روحانی تسکین کی تلاش میں پہنچ چکے ہیں۔ گو نظم و نسق اور معیارِ زندگی کے وہ کرشمے جن میں وہ رہ رہے تھے، یہاں انہیں نصیب نہیں ہیں، مگر پھر بھی وہ خوش ہیں۔ کعبۃ اللہ کے انوار و فیوض، بادشاہِ ارض و سما کے دربار کا شکوہ و جلال اور انسانی سجدوں کی وحدت دیکھ کر وہ اس قدر سرمست و وارفتہ ہو چکے ہیں کہ انہیں اور کسی بات کا ہوش نہیں ہے۔ شاید اب دنیا کا ایسا کوئی خطہ نہیں رہا ہے جہاں سے پروانے ابراہیم علیہ السلام کی جلائی ہوئی شمع پر آ کر ٹوٹ ٹوٹ کر نہ گر رہے ہوں۔ یہ سب کیوں اس اضطراب و پشیمانی کے عالم میں جمع ہیں۔ کیوں ایک چوکور عمارت کے

گرد محو گردش ہیں، کیوں اُس کے دروازے، ملتزم، کو چمٹے ہوئے ہیں۔ کیوں اُس کے غلاف کو تھام کر آہ و بکا کر رہے ہیں۔ کیوں کبھی سجدے میں جا کر اور کبھی ہاتھ اٹھا کر دل کی بے تابی کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ کیوں مقامِ ابراہیم پر جمع ہیں، کیوں میزابِ رحمت کے نیچے جمگھٹا کیے ہوئے ہیں، کیوں حجرِ اسود پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں ــــ پورا حرم کیوں نالہ و شیون سے گونج رہا ہے۔ اور پھر جماعت کھڑی ہو جانے پر کیوں پوری فضا پر پردۂ سکوت طاری ہو جاتا ہے اور طواف و سعی بند ہو جاتی ہے؟ ــــ اِن سب سوالات کا ایک ہی جواب ہے۔ یہ سب اپنے رب کے حضور اپنے گناہوں کی مغفرت اور آخرت کی نجات کے لیے آئے ہیں۔ اپنی عبدیت و بندگی اور فرماں برداری و اطاعت شعاری کے اظہار کے لیے آئے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ وہ گناہوں اور خطاؤں سے لبریز ہیں اور اس گھر کا مالک معاف کر دینے والا مہربان آقا ہے۔ پس جو یہاں اخلاص و صدق کے ساتھ آیا اور سچے دل کے ساتھ اُس نے گناہوں کی معافی مانگ لی اور ان شرائط و اوصاف کی پابندی کی جو یہاں کی حاضری کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں تو یقیناً اُن کا آقا انہیں معاف کر دے گا، بلکہ اپنی جناب سے مزید رحمت سے انہیں نوازے گا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جس نے اس شان کے ساتھ حج کیا کہ اُس نے کوئی زبان یا عمل سے ممنوع کام نہیں کیا اور نہ لڑائی جھگڑا کیا تو یوں واپس لوٹے گا جیسے اُس کی ماں نے آج ہی جنا ہو۔

جیسا کہ پچھلے خط میں عرض کیا تھا کہ اس سال ہم التوعیۃ الاسلامیہ کے ارکان حرم شریف کے اندر درس دینے کے بجائے مکہ معظمہ کے مختلف محلوں اور معلموں کے پاس جا کر حجاج کی قیام گاہوں اور مسجدوں کے اندر خطاب کرتے ہیں اور مناسکِ حج بیان کرتے ہیں اور لوگوں کے استفسارات کا جواب دیتے ہیں۔ اس نئے پروگرام کا فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ ہمیں حجاج کرام کی اصل کیفیت اور ان کے عام مسائل سے بھی آگاہی ہو رہی ہے۔ رات ہم مکی مرزوقی معلم کے ہاں گئے۔ وہاں پاکستانی حاجیوں نے اس کی شکایت شروع کر دی۔ بتایا کہ یہ صاحب اس قدر کج خلق ہیں کہ بعض پاکستانی حاجیوں کو انہوں نے تھپڑ تک مارے ہیں۔ دراصل پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے لوگ خواہ وہ حاجی ہوں ... توم ... جانتے ہیں۔ ان کے لیے

عرب بھائیوں نے ایک لقب تجویز کر رکھا ہے "رفیق"۔ اس لقب کے ذریعے وہ اہانت آمیز لہجے میں اس قوم کے افراد کو پکارتے ہیں اور پھر اپنی زبان میں گالم گلوچ بھی کر لیتے ہیں ۔ دکاندار ہو یا ٹیکسی ڈرائیور، پولیس کا آدمی ہو یا سکول کا طالب علم جونہی اُس کا سابقہ پاکستانی سے پیش آئے گا اُس کی توہین و تحقیر سے اپنے دل کی تسکین کرے گا۔ سب لوگ ایسے نہیں ہیں، کچھ اچھے اور با اخلاق عرب بھی ہیں۔ علی الخصوص یہاں کے دینی حلقے۔

حجاج کو چند سالوں سے ایک عجیب و غریب تکلیف پیش آ رہی ہے اور ابھی تک اس کا مؤثر علاج نہیں کیا گیا۔ وہ تکلیف یہ ہے کہ جب سے معلمین کا انتخاب حاجیوں کے بجائے سعودی حکومت کے مقرر کردہ ادارے پر چھوڑ دیا گیا ہے ایسے بے شمار واقعات پیش آ رہے ہیں کہ میاں اور بیوی بچھڑ جاتے ہیں، ماں اور بیٹا بچھڑ جاتے ہیں۔ الغرض ایک گروپ کے وہ افراد جنہیں حج میں باہم رہنا چاہیے انہیں ادھر اُدھر بانٹ دیا جاتا ہے اور اب رہائش کے مسئلے میں بھی استحاد کے بجائے افتراق کے کئی واقعات پیش آئے ہیں۔ تادمِ تحریر پاکستان ہاؤس مکہ میں چھ سات ایسی خواتین بیٹھی ہوئی ہیں جو اپنی ساتھیوں سے بچھڑ چکی ہیں اور وہ شب و روز رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہیں۔ ان کی عبادت کے دن اس پریشانی میں گزر رہے ہیں۔ ایک عورت اپنے بچے سے بچھڑ جانے کی وجہ سے پاگل ہو چکی ہے۔ پاکستان ہاؤس والے اِس سلسلے میں اپنی حد تک بڑی محنت اور تگ و دَو کر رہے ہیں، لیکن بعض مسائل میں وہ بھی بے بس ہو جاتے ہیں۔ چند سال پیشتر کی بات ہے کہ معلم کا انتخاب خود حاجی اپنے ملک سے روانہ ہونے سے پہلے کر لیتے تھے۔ اس انتخاب میں ان کی اپنی مرضی اور تجربے کو دخل ہوتا تھا۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ ایک تو گروپ بچھڑتا نہیں تھا، اور دوسرا معلم بھی کچھ نیاز مند رہتا تھا تاکہ اس کی شہرت پر حرف نہ آئے۔ اب معلم کسی حاجی کا نیاز مند نہیں ہے اس لیے اُسے حجاج کی خدمت اور حجاج سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں، اگر طبعاً کوئی معلم شریف اور شفیق ہے تو یہ الگ بات ہے؛ ورنہ اور کوئی ایسا خارجی دباؤ نہیں ہے جس سے وہ حسنِ سلوک کو اپنا فرض سمجھے۔ وزارتِ حج معلم کا محاسبہ کر سکتی ہے، مگر وہاں تک شکایت کون پہنچائے۔

رات ہمارا پروگرام اجیاد کے اندر تھا۔ ہم لوگ دو تین گروپوں میں بٹ گئے۔ خاکسار کے رستے میں معلّم سمیر عبدالرحمان سقاط آیا۔ اس معلّم کا ٹھکانہ اجیاد پہاڑی کے اوپر ہے۔ اس کے پاس افغانستان کے حجاج ٹھیرے ہوئے ہیں۔ اجیاد کا یہی وہ علاقہ ہے جس کے بارے میں سیرت کی کتابوں کی روایت کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "میں بچپن میں چند قراریط کے عوض اجیاد میں بکریاں چرایا کرتا تھا"۔ انہی پہاڑیوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بکریاں چرایا کرتے تھے جن پر اب ہم چڑھ کر افغان حاجیوں کا اجتماع منعقد کر رہے ہیں۔

ہمارے گروپ میں ایک افغانی طالب علم ہیں جن کا نام سید رحیم ہے۔ وہ ہمارے پشتو اور فارسی زبان کے ترجمان ہیں۔ افغانستان کے اندر سے جو لوگ حج کرنے کے لیے آتے ہیں ان کی تعداد چار ہزار ہے۔ کچھ افغان وہ ہیں جو پاکستان اور عرب ممالک سے آتے ہیں۔ افغانی حاجیوں کی مجموعی تعداد سات ہزار ہے۔ افغانستان کے اندر سے آنے والے بیشتر حاجی معلّم سمیر عبدالرحمٰن سقاط کے پاس ٹھیرے ہوئے ہیں۔ ان افغانی حاجیوں سے بعض لوگوں کے ساتھ تنہائی میں بات چیت کرنے سے افغانستان کے عجیب و غریب حالات معلوم ہوئے۔ ایک نوجوان نے بڑی رازداری کے ساتھ بتایا کہ افغان حکومت نے ہمیں حج کی اجازت دیتے وقت ہمارے بچوں کو یرغمال کے طور پر رکھ لیا ہے۔ جب تک ہم واپس افغانستان نہیں جاتے ہمارے بچے روزانہ پولیس تھانے میں حاضری دیتے رہیں گے۔ کابل شہر کے حاجیوں نے بتایا کہ وہاں ہر رات دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ لوگ عصر کے بعد ہی گھروں میں چلے جاتے ہیں۔ کابل کی راتیں مجاہدین کی سرگرمیوں کے دباؤ میں گزرتی ہیں۔ تمام حجاج نے افغانستان کی اقتصادی بدحالی اور اشیائے خوراک کی قلت اور گرانی کا رونا رویا۔ عام حالات میں سات کلو چاول تین سو افغانی کے لگ بھگ ملتے ہیں لیکن جب مجاہدین شاہراہیں بند کر دیتے ہیں اور سپلائی رک جاتی ہے تو یہی سات کلو چاول سات سو افغانی میں بمشکل دستیاب ہوتے ہیں۔ سات کلو ایندھن کی لکڑی ۱۸۰ اور ۲۰۰ افغانی کے درمیان ملتی ہے۔ فصلیں اور باغات روسی ہیلی کاپٹروں کی بمباری سے جلتے رہتے ہیں۔ افغانستان کا سرحدی

زبوں حالی اور بدامنی کا شکار ہو چکا ہے۔

خاکسار نے افغانستان کے حاجیوں کے اندر مختصر خطاب کیا۔ حاضری خاصی تھی۔ سب لوگ پہاڑی پر ادھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے۔ دین کے مبادیات اور مناسکِ حج بیان کرنے کے بعد خاکسار نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی کہانی بیان کی اور پھر ان اسباب کی نشان دہی کی جو ہمیشہ مسلمانوں کے تنزل کی تہہ میں کارفرما رہے ہیں۔ آخر میں جہاد اور اس کے فوائد بیان کیے۔ خاکسار اپنی تقریر ختم کرنے والا تھا کہ متعدد حاجیوں نے بآوازِ بلند کہا کہ افغانستان میں اسلام کی کامیابی کے لیے دُعا کی جائے۔ چنانچہ افغانستان کی آزادی، مجاہدین کی کامیابی اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے دعائیں کی گئیں۔ حاضرین اشک بار تھے اور پہاڑی آمین کی دلگداز صداؤں سے گونج رہی تھی۔

ہمارے ایرانی بھائی کافی تعداد میں آئے ہوئے ہیں۔ سرکاری اعلان کے مطابق ان کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے۔ وہ تقریباً تمام عزیزیہ محلہ میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ ہمارا دفتر اور رہائش گاہ بھی اسی محلے میں ہے۔ یہ حضرات سارا دن دکانوں پر گزارتے ہیں۔ ان کی خریداری بالعموم تین چار چیزوں تک محدود ہے۔ ٹیلی وژن، ریڈیو، جوس نکالنے والی مشین اور کپڑا۔ ہمارے دفتر کے قریب جو مسجد ہے اُس میں ظہر کے وقت یہ حضرات بھی آکر نماز پڑھتے ہیں۔ ایک روز خاکسار نے ایک ایرانی بزرگ سے ایران کے اندرونی حالات دریافت کیے تو اُس نے یہ مختصر سا جواب دیا: "مردم پائیں بالا شدند" (نچلے لوگ اُوپر آگئے)۔ ایرانی حجاج کی تنظیم نوجوان گروہ کے ہاتھ میں ہے جن کا تعلق پاسدارانِ انقلاب سے ہے۔ انہوں نے اپنے ملک کے حجاج کا نظم ونسق بہت اچھا کر رکھا ہے۔ سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ انہوں نے مکہ معظمہ کی مختلف سڑکوں پر جگہ جگہ "امدادِ گمشدگان" کا بورڈ لگا رکھا ہے۔ جو ایرانی حاجی گم ہو جاتا ہے وہ اُس بورڈ کے پاس پہنچ جاتا ہے جہاں اُسے رہنمائی کرنے والے کارکن مل جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں پاکستانی حاجیوں کا جو حال ہوا ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ کئی کئی روز تک مرد اور عورتیں گم رہتے ہیں اور اس حالت میں وہ نڈھال ہو جاتے ہیں، مگر کوئی پتہ بتانے والا یا ساتھیوں سے ملانے والا نہیں ملتا۔

کیا بتائیں، ان واقعات کو دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کیا پاکستانی حجاج کے منتظمین "امداد گم شدگان" کے جگہ جگہ مراکز نہیں قائم کر سکتے؟ کیا پاکستان کی وزارت حج کی طرف سے چند جیپیں اس غرض کے لیے مخصوص نہیں کی جا سکتیں کہ وہ مختلف علاقوں میں گمشدگان کی امداد کا اعلان کرتی پھریں؟

التوعیۃ الاسلامیۃ نے پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی اپنا بھرپور تبلیغی نظام جاری کر رکھا ہے۔ اس وقت ۲۹۳ مبلغین مختلف زبانوں میں مختلف مقامات پر دعوت و ارشاد کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے ۲۱۳ داعی سعودی عرب کے ہیں اور ۸۰ داعی ۳۴ دیگر ممالک سے آتے ہیں۔ ان مبلغین کے ساتھ ۷۰ ترجمان کام کر رہے ہیں۔ یہ ترجمان سعودی جامعات کے طلبا ہیں۔ بایں ہمہ عام لوگ احکام حج سے ناواقفیت کی بنا پر ایسے ایسے کام کر ڈالتے ہیں جو حج کی روح کے بھی خلاف اور حج کے احکام و مناسک کی صحت کے بھی منافی ہوتے ہیں۔ بہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے اور طرح طرح کی تکالیف اٹھا کر حج میں شریک ہوتے ہیں، مگر جب حج کے مناسک ادا کرنے کا وقت آتا ہے تو لاعلمی کا اظہار کر کے بری الذمہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص نماز کے لیے مسجد میں پہنچ جائے اور پھر نماز نہ پڑھے اور اگر پڑھے تو رکعتوں کی تعداد سے ناواقفیت کی وجہ سے فرض کی دو رکعت کی چار یا چار کی دو پڑھ ڈالے اور پھر سادگی کے ساتھ کہہ دے: "اللہ منظور کرنے والا ہے"۔ ہماری وزارت حج کو مناسکِ حج کی تعلیم و تربیت کا موثر اور مستقل انتظام کرنا چاہیے۔ موجودہ حج کے سرکاری تربیتی پروگرام قطعاً لاحاصل ہو رہے ہیں۔

ذوالحجۃ کی ۶ تاریخ مکہ معظمہ میں اس لحاظ سے ہنگامی حالت اختیار کر جاتی ہے کہ اس روز حجاج چاروں طرف سے پہنچ جاتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں جو حجاج جمع ہو چکے ہوتے ہیں وہ بھی مکہ معظمہ آ جاتے ہیں۔ اور سعودی عرب اور اردگرد کے عرب ممالک کے قافلے بھی مکہ میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں، کیونکہ ۸ تاریخ کو حج کا پہلا دن جسے یوم الترویہ کہتے ہیں شروع ہو جاتا ہے۔ نہ صرف حرم شریف میں طواف و سعی کرنے والے ایک انسانی سمندر کی شکل اختیار

کر جاتے ہیں، بلکہ مکہ معظمہ کی سڑکیں، بازار اور گلیاں محلے سب انسانوں سے اس قدر بھر جاتے ہیں کہ نقل و حرکت بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ مزید برآں یہ کہ مکانات کی قلت کی وجہ سے لوگ میدانوں اور سڑکوں کے فٹ پاتھوں پر ڈیرے جما لیتے ہیں۔ کل ۶ ذوالحجہ تھی اور ہم نے مکہ معظمہ کی جو کیفیت اُوپر بیان کی ہے وہ پوری طرح برو ئے کار آچکی تھی۔ گرمی بھی شدید تھی، مگر حاجیوں کی بے بسی اور اُن کی مشکل اور پریشانی کا آپ اندازہ لگائیں کہ ایک طرف وہ اس نازک ترین کیفیت میں رہ رہے ہیں اور دوسری طرف صبح سات بجے سے لے کر بارہ بجے تک پورے پانچ گھنٹے ہمارے ایرانی بھائی ڈیڑھ لاکھ کی تعداد میں مکہ معظمہ کی اُس مرکزی شاہراہ پر جلوس نکالے ہوئے ہیں جس میں ہر طرف سے آکر سڑکیں ملتی ہیں۔ مرکزی شاہراہوں نے ٹریفک بند کر دی ہے اور نتیجۃً پورے مکہ کی ٹریفک بند ہو چکی ہے پیادہ چلنے والوں کا سیلاب بھی راستہ نہ پاکر آپس میں ٹکرا رہا ہے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے لوگ نڈھال ہیں، مگر راستے بند۔ نعرے بلند ہو رہے ہیں، مختلف ممالک کا نام لے کر انہیں "مرگ" کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ بوڑھے مرد و عورت جن کی تعداد حج میں کافی ہوتی ہے اور جو سفرِ حج اور اعمالِ حج کی وجہ سے ذہناً و جسماً پامال ہو چکے ہوتے ہیں، ایک نئی مشکل میں گرفتار ہو چکے ہیں، بلکہ متعدد حجاج دم گھٹ کر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اللہ کے شہر میں ذکر و استغفار، توبہ و انابت، خشوع و انکساری اور دلجوئی و دست گیری کے بجائے مظاہرین اُچھل کود کر رہے ہیں۔ ہاتھوں کے اشاروں سے دوسروں کے لیے تذلیل و تحقیر کے دائرے بنا رہے ہیں، خود پسندی اور خود سری کے جذبات کا مظہر بنے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا وہ شہر جہاں چیونٹیوں تک کو امان مل چکی ہے، جہاں کے درختوں اور پودوں کو اُکھاڑنا شریعت نے منع کر رکھا ہے اور جہاں اللہ کے ذکر اور اللہ کے رسولؐ کے ذکر کے سوا کسی اور کا نام بلند کرنا درست نہیں ہے وہاں ضیوف الرحمٰن (خدا کے مہمان) تنگی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ہجوم میں ایک دوسرے سے بچھڑ بچھڑ کر روتے پھر رہے ہیں۔ ایک سیاسی لیڈر کی قد آدم تصاویر حرم و کوچہ ہائے حرم میں بلند کی جا رہی ہیں۔ یہ ہے تشریح اُس نعرے کی کہ:

"ہماری عبادت سیاست ہے اور ہماری سیاست عبادت ہے"۔

کل ۶ ذوالحجہ ہی کو نمازِ عشا کے بعد جب لوگ حرم سے نکلے تو انہیں ایک اور آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ باب الملک عبدالعزیز کے سامنے ایشیا کے دو تین سو نوجوانوں نے جلوس نکال لیا۔ انہوں نے سر پہ سبز پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ ہاتھوں میں سبز بینر اٹھا رکھے تھے، کچھ کتبے بھی تھے جن پر طرح طرح کی عبارتیں درج تھیں، چند عورتیں بھی تھیں جنہوں نے سر ننگے کر کے گلوں میں سبز پٹیاں لٹکا رکھی تھیں۔ یہ لوگ بھی عجیب و غریب نعرے لگاتے ہوئے سڑک پہ مارچ کرنے لگے۔ حرم میں سے لوگوں کا سیلاب نماز ختم ہوتے ہی باہر اُمڈ پڑا۔ آگے ان مظاہرین نے سڑک بلاک کر رکھی تھی۔ حاجی بے چارا ہوا کے جھونکے سے بھی ڈرتا ہے یہ صورتِ حال دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ بہرحال پولیس کے دستے آگئے اور انہوں نے پانی پھینک کر مظاہرین کو بھگا دیا، مگر اس بھگدڑ میں بہت سے لوگ کچلے گئے، متعدد زخمی ہو گئے اور کئی دستی سامان گم کر بیٹھے۔ بتایئے یہ صحیح ہے؟

امام بغویؒ

۴۳۶ھ تا ۵۱۹ھ

جناب عبد الرشید عراقی - سوہدرہ -

نام و نسب امام بغویؒ کا نام حسین بن مسعود، کنیت ابو محمد اور محی السنۃ لقب تھا۔[1]

ولادت و وطن ۴۳۶ھ بغ میں پیدا ہوئے۔ بغ ہرات اور خراسان کے درمیان ایک مقام ہے۔ اس شہر کو مشہور علمائے کرام کے مولد و مسکن کا شرف حاصل ہے۔ اب یہ شہر صفحۂ ہستی پر موجود نہیں۔ یاقوت حموی کے بیان کے مطابق ۶۱۶ھ کے بعد یہ شہر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔[2]

اساتذہ و تلامذہ امام بغوی کے اساتذہ میں اس وقت کے مشہور اساطینِ فن کے نام ملتے ہیں۔ قاضی حسین جن کو فقہ میں بڑا کمال حاصل تھا اور ان کا شمار اجلہ شوافع میں ہوتا تھا، امام بغویؒ کے استاد تھے۔ اور امام بغویؒ نے فقہ کی تحصیل ان ہی سے کی۔ ان کے علاوہ آپ کے کئی ایک اور اساتذہ تھے جن کا ذکر ارباب سیر نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ تلامذہ میں ابو المکارم فضل اللہ بن محمد توقانی تھے۔ یہ امام ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) کے استاد

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۴۵ و بستان المحدثین ص ۵۲۔

[2] تاریخ ابن خلکان جلد ۱ ص ۲۶۰ و معجم البلدان جلد ۱ ص ۲۴۵، ۲۴۶۔

شیخ فخر الدین علی مقدسی کے استاد تھے۔[1]

تحصیل حدیث کے لیے رحلت | امام بغویؒ کے سماع حدیث کے لیے رحلت و سفر کی تصریح تذکرہ نگاروں نے نہیں کی۔ لیکن علامہ ابن السبکی (م ۷۷۱ھ) نے لکھا ہے کہ آپ نے ۴۶۰ھ کے بعد حدیث کی سماع کا آغاز کیا تھا۔[2]

حدیث میں مقام | امام بغویؒ کا حدیث میں درجہ و مقام مسلم ہے۔ اربابِ سیر اور محدثین کرام نے اس فن میں ان کا صاحبِ کمال ہونا تسلیم کیا ہے۔ علامہ ابن السبکی (م ۷۵۶ھ) ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) اور ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے حدیث میں ان کا صاحب کمال ہونا تسلیم کیا ہے اور ذہبی نے ان کو الحافظ کے لقب سے یاد کیا ہے[3] اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

> امام بغوی بے نظیر محدث، معتبر اور معتمد شارحین حدیث میں سے تھے۔ شوافع میں احادیث کی شرح و توجیہہ کے لیے جو علماء ممتاز سمجھے جاتے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہیں۔ ان کا لقب محی السنۃ اس فن میں ان کی عظمت و کمال کا ثبوت ہے۔[4]

جامعیت و اعترافِ کمالات | امام بغویؒ اسلام کے تین اہم بنیادی علوم یعنی تفسیر، حدیث اور فقہ میں ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ اربابِ سیر اور محدثین کرام نے قرآن و سنت اور فقہ کے علوم میں ان کا جامع، امام اور یکتائے روزگار ہونا تسلیم کیا ہے۔ علامہ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:-

> امام بغویؒ ان تین علوم (تفسیر، حدیث و فقہ) میں فاضل تھے۔[5]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۵۵، ۵۶ و طبقات الشافعیہ (ابن السبکی) جلد ۴ ص ۲۱۴، ۲۱۵

[2] طبقات الشافعیہ جلد ۴ ص ۲۱۴

[3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۵۴

[4] عجالہ نافعہ مع فواید جامعہ ص ۱۷

[5] البدایہ والنہایہ جلد ۱۲ ص ۱۹۳

حضرت شاہ عبدالعزیز ؒ محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

امام بغوی ان تین فنون (تفسیر، حدیث و فقہ) میں جامع اور ہر ایک میں مرتبۂ کمال پر فائز تھے۔ ان کی پوری زندگی انہی علوم کے پڑھنے پڑھانے میں بسر ہوئی۔[1]

علامہ السبکی ؒ (م ۷۷۱ھ) لکھتے ہیں:

بغوی کو فقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا اور ان کی معلومات کا دائرہ نقل و تحقیق ہر اعتبار سے وسیع تھا۔[2]

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) نے قرآن مجید کی تفسیر و تشریح میں بے عدیل[3]، ابن السبکی (م ۷۷۱ھ) نے فقہ میں یگانۂ روزگار[4]، ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے حدیث میں ان کو امام[5] تسلیم کیا ہے۔ اور ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) علوم کا سمندر بتایا ہے[6]۔ اور ابن عماد (م ۱۰۸۹ھ) نے ان کو امام و عالم خراسان تسلیم کیا ہے[7]۔

اور یہاں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ امام بغوی ؒ تفسیر، حدیث اور فقہ تینوں علوم کے جامع تھے۔ اور ان کی ساری زندگی ان تینوں علوم کی نشر و اشاعت میں بسر ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں علم و فن کی خدمت ان کا خاص مشغلہ تھا۔

علم و فضل تذکرہ نگاروں نے ان کے علم و فضل، زہد و عبادت، صلاح و تقویٰ اور متبع سنّت ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے ان کو قائم اللیل اور

۱ بستان المحدثین ص ۵۲
۲ طبقات الشافعیہ جلد ۴ ص ۲۱۲
۳ بستان المحدثین ص ۵۲
۴ طبقات الشافعیہ جلد ۴ ص ۲۱۲
۵ تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۵۴
۶ تاریخ ابن خلکان جلد ۱ ص ۵۹
۷ طبقات الشافعیہ جلد ۴ ص ۲۱۴، ۲۱۵۔

صائم النہار لکھا ہے[1]۔

وفات | ۵۱۹ھ میں امام بغوی کی وفات ہوئی اور طالقان میں اپنے استاد قاضی حسین کے مقبرہ کے پاس دفن ہوئے[2]۔

تصنیفات | امام بغوی کا شمار بہترین مصنفین میں ہوتا ہے۔ تفسیر، حدیث، قراءت اور فقہ جیسے اسلامی علوم پر ان کی تصنیفات ہیں۔ اور علمائے کرام نے ان کی تصنیفات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

امام صاحب کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:۔

تفسیر سے متعلق | معالم التنزیل

حدیث سے متعلق | ۱۔ مصابیح السنۃ ۲۔ شرح السنۃ ۳۔ الجمع بین الصحیحین ۴۔ شرح ترمذی[3] ۵۔ ارشاد الانوار فی شمائل النبی المختار ۶۔ تجرید

فقہ سے متعلق | ۱۔ التہذیب فی الفقہ ۲۔ تعلیقات فتاویٰ قاضی حسین ۳۔ ترجمۃ الاحکام فی الفروع ۴۔ الکفایہ فی الفقہ ۵۔ فتاوی بغوی۔

قراءت سے متعلق | الکفایۃ فی القراءۃ

تاریخ | ۱۔ معجم الشیوخ ــــ تعداد کل تصنیفات (۱۴)

اب یہاں آپ کی دو مشہور تصنیفات تفسیر معالم التنزیل اور مصابیح السنۃ کا مختصر تعارف پیش کیا جائے گا۔

معالم التنزیل | یہ تفسیر کی مشہور متداول کتاب ہے۔ اس میں صحابہ کرام، تابعین اور

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۵۴۔

[2] تاریخ ابن خلکان جلد ا ص ۲۵۹، ۲۶۰۔

[3] علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۵ھ) اپنے مضمون "حجاز کے کتب خانے" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کا نسخہ آپ نے کتب خانہ جمہوریہ مدینہ منورہ میں دیکھا تھا۔
(مقالات سلیمان جلد ۲ ص ۲۷۰)

تبع تابعین اور متقدمین علماء کے تفسیر کے اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ اس کی حیثیت ماثوری تفسیر کی ہے۔

امام صاحب نے شروع میں ایک مقدمہ لکھا ہے، جس میں کلام مجید کی اہمیت، اس کے نزول کا مقصد اور ائمہ سلف کی تفسیری خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے:

گو اکابر مفسرین کے کارناموں پر اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے لیکن قدیم کی تجدید کے لیے ان میں کاوش وجد وجہد کا سلسلہ برابر جاری رکھنا چاہیے اس لیے میں نے لوگوں کی فرمائش پر ایک متوسط درجہ کی کتاب مرتب کی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ اس فن میں اشتغال رکھنے والوں کے لیے یہ مفید ثابت ہوگی [1]

امام صاحب نے اپنی اس مایۂ ناز تفسیر اسباب نزول کی تعیین، ناسخ ومنسوخ کی تصریح، فقہاء کے احکام شرعی کے استنباطات کا ذکر، اعراب اور قرات کا اختلاف نحوی وصرفی اشکال پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ان مباحث کی توضیح کے لیے احادیث اور آثار صحابہ و تابعین سے مدد لی ہے۔

علامہ علاؤ الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی المعروف خازن (م ۷۴۱ھ) کی تفسیر لباب التنزیل جو تفسیر خازن کے نام سے معروف ہے۔ تفسیر معالم التنزیل کا ملخص ہے، جیسا کہ خازن نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اس کی تصریح کی ہے [2] اور خازن اس تفسیر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

علم تفسیر میں بغوی کی معالم التنزیل بڑی اہم اور بلند پایہ کتاب ہے۔ یہ صحیح اقوال کا مجموعہ ہے، شکوک وتصحیف سے پاک، احادیث وآثار سے مزین اور عجیب واقعات پر مشتمل ہے [3]

---

[1] مقدمہ معالم التنزیل

[2] مقدمہ تفسیر خازن جلد ۱ ص ۳، [3] ایضاً جلد ۱ ص ۳

تفسیر معالم التنزیل ہندوستان اور مصر سے شائع ہو چکی ہے اور ۱۳۳۱ھ میں تفسیر خازن کے حاشیہ پر ۷ جلدوں میں شائع ہوئی۔

مصابیح السنۃ یہ حدیث کی مشہور و معتبر کتاب ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ امام ولی الدین خطیب تبریزی (م ۷۳۷ھ) کی مشہور و متداول کتاب مشکوٰۃ المصابیح جو عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کا تکملہ ہے۔

صاحب مشکوٰۃ خطیب تبریزی مصابیح السنۃ کے بارے میں لکھتے ہیں:

محی السنۃ قامع البدعۃ امام بغوی کی کتاب مصابیح السنۃ نہایت جامع کتاب ہے لیکن اس میں اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور سندیں حذف کر دی گئی ہیں۔ امام بغوی نے مصابیح السنۃ میں دو فصلیں قائم کی ہیں۔ میں نے (مشکوٰۃ المصابیح) میں ایک فصل کا اضافہ کیا ہے[1]

تقسیم و ترتیب یہ کتاب ابواب و فصول میں منقسم ہے۔ ہر باب کی حدیثیں دو فصلیں ہیں اور ان فصلوں میں صحاح و حسان کے عنوان سے حدیثیں درج کی گئی ہیں۔ صحاح کے اندر بخاری و مسلم اور حسان کے اندر ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی وغیرہ کی حدیثیں درج ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ کتاب نیت والی حدیث سے شروع ہوتی ہے اور نیت ہی ہر کام کا سرا ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ آخرت کے لفظ پر ہے جو کتاب کے حسنِ خاتمہ کی خبر دیتا ہے[2]

تعداد احادیث مصابیح السنۃ میں احادیث کی تعداد ساڑھے چار ہزار کے لگ بھگ ہے اور اس میں نصف سے کچھ کم احادیث بخاری و مسلم کی ہیں۔ باقی احادیث دوسری کتابوں کی ہیں[3]

مصابیح السنۃ کی خصوصیات ائمہ صحاح اور اکابر محدثین کی روایات کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اس کی احادیث نہایت معتبر و مستند تسلیم کی جاتی ہیں۔ اور اس میں جو احادیث غریب اور

---

[1] مقدمہ مشکوٰۃ المصابیح [2] بستان المحدثین۔ ص ۱۳۲۔
[3] کشف الظنون جلد ۲ ص ۴۴۲

ضعیف ہیں۔ امام بغوی نے اس کی نشان دہی کر دی ہے۔ اس وجہ سے کتب حدیث میں مصابیح السنۃ کا پایہ نہایت بلند ہو گیا ہے۔

مصابیح السنۃ ایمانیات، اعتقادیات اور اعمال و احکام ہر قسم کی روایتوں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے ہر طرح کا ذوق رکھنے والے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کی ترتیب بہت عمدہ ہے اور محدثین کرام نے اس کی ترتیب کو پسند کیا ہے [۱]

ایک اعتراض اور اس کا جواب محدثین کرام کے نزدیک حسان کی جو تعریف ہے امام بغوی نے اس سے ہٹ کر حسان کی تعریف کی ہے۔ اسی پر صحیح مسلم کے مشہور شارح امام نووی ؒ (م ۶۷۶ھ) نے اعتراض کیا ہے۔ امام نووی ؒ لکھتے ہیں:

واما التقسیم البغوی الی حسان وصحاح مریدا بالصحاح ما فی الصحیحین وبالحسان ما فی السنن فلیس بصواب لان فی السنن الصحیح والحسن والضعیف والمنکر [۲]

یعنی بغوی نے صحاح و حسان کی تقسیم کر کے جو صحاح سے صحیحین کی اور حسان سے سنن کی حدیثیں مراد لی ہیں، وہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ سنن میں تو صحیح حسن ضعیف اور منکر ہر طرح کی حدیثیں ہیں۔

محدثین کرام نے امام نووی کے اس اعتراض کا یہی جواب دیا ہے کہ بغوی کی خاص اصطلاح ہے اور یہ ایک نئی اصطلاح ہے۔ جو عرفی اصطلاح پر جاری نہیں ہو سکتی [۳]

مصابیح السنۃ کی شروح و مختصرات مصابیح السنۃ کی اہمیت اور خصوصیات کی وجہ سے اس کی متعدد شرحیں اور مختصرات لکھے گئے ہیں۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون [۴] اور محی السنۃ امیر الملک حضرت سید نواب صدیق حسن خان قنوجی رئیس بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) نے اتحاف النبلاء [۵] میں ۲۹ شروح و مختصرات کا نام لکھے ہیں۔

---

[۱] کشف الظنون جلد ۲ ص ۴۴۴ [۲] تقریب مع شرح تدریب الراوی ص ۵۴ - [۳] ایضاً
[۴] کشف الظنون ص ۴۴۴، ۴۴۵ [۵] اتحاف النبلاء ص ۱۵۱، ۱۵۲ -

رسائل و مسائل

مہر کا استحقاق

سوال:- ایک مولوی صاحب سے ایک دن میں نے سنا کہ لڑکی جتنا حق مہر مانگے مانگ سکتی ہے اور پھر اگر یہ رقم لڑکی اپنے باپ یا بھائی کو دے دے دے سکتی ہے اور اگر حق مہر مانگ سکتی ہے تو کیا نکاح کے ٹائم مانگ سکتی ہے یا منگنی کے دنوں میں؟

حالانکہ حقیقت واضح ہے کہ اکثر لوگ اپنی بہنوں اور لڑکیوں کو بیچتے ہیں اور مقصود حق مہر کے بجائے دولت بٹورنا ہوتا ہے۔

واضح کریں کہ حقیقت کیا ہے اور قرآن اور حدیث کی رو سے اسلام حق مہر کو کہاں تک جائز قرار دیتا ہے؟

جواب:-

مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے جس کی قیمت آج کل کے حساب سے سو روپے کے لگ بھگ بنتی ہے۔ اس سے زیادہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے، عورت جتنا مہر چاہے رکھوا سکتی ہے۔ لیکن اعتبار اس مقدار کا ہوگا جو نکاح کرتے وقت فریقین طے کر لیں۔ اور ادائیگی اسی طرح کرنا ہوگی جس طرح طے ہوئی ہو۔ اگر فوری ادائیگی کا فیصلہ ہوا تو فوری ادائیگی کرنا پڑے گی اور بعد میں دینا قرار پایا ہو تو بعد میں دینا ہوگا۔ مہر عورت کی ملک ہوتا

ہے وہ اس میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتی ہے ۔ باپ کو دینا چاہے یا خاوند کو معاف کر دے ، دونوں صورتوں کی اجازت ہے ۔ لیکن ایسا عورت کی آزاد مرضی سے ہونا چاہیے ۔ اس بات کو رواج دے دینا کہ عورت کا مہر نکاح سے پہلے اس کے والد کو دیا جائے اور وہ اسے اپنی ضروریات میں استعمال کرے درست نہیں ہے ۔ البتہ والد اگر مہر کی رقم وصول کر کے لڑکی کے لیے جہیز وغیرہ بنائے اور لڑکی کی ملکیت میں دے دے تو اس کی گنجائش ہے ۔ بہر حال کچھ لوگ شریعت کی دی ہوئی رخصت کو اپنی اغراض پورا کرنے کا ذریعہ بنائیں تو اسے روکنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ کا خوف پیدا کیا جائے ۔ دعوت و تبلیغ اور ترغیب و ترہیب کے ذریعے معاشرے میں بھلائیوں کو نشوونما دینے کی جدوجہد سے ہی غلط رسوم اور دنیا پرستی کی بیماریوں کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے ۔ جو لوگ اس کا احساس رکھتے ہیں انہیں اس میدان میں کام کرنے والی قوتوں کے ساتھ جدوجہد میں بھرپور حصہ ادا کرنا چاہیے ۔

(ناظم شعبہ استفسارات)

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورت استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں ۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے ۔

(ادارہ)

مطبوعات

پچھلے کئی ماہ میں کبھی تو کتابوں پر تبصرہ کی جگہ ہی نہیں نکلی اور کبھی صفحہ دو صفحے پر دو چار کتابوں کا تعارف شائع ہوا، نتیجہ یہ کہ کتابوں کا ایک ڈھیر جمع ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ چند صفحات میں زیادہ سے زیادہ کتابوں کا تذکرہ کرنے کے لیے اختصار سے کام لینا پڑا ہے۔

جواہر القرآن - جلد اوّل مؤلف: جان فیصل آبادی - ناشر: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ لاہور - بڑے سائز پر مناسب معیارِ اشاعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ ۶۳۶ صفحات - قیمت: ۱۰۵/- روپے جو کسی طرح زیادہ نہیں۔

یہ کتاب نہ تو ترجمۂ قرآن ہے، نہ تفسیر بلکہ اس میں سورۃ بہ سورۃ اور آیت بہ آیت حاصلِ مطالب اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ "نص" (اور متنِ قرآن) کا دامن مؤلف نے کہیں نہیں چھوڑا۔ تفاسیر و تراجم کے وسیع مطالعہ کی مدد سے خلاصۂ مدعا بیان کرتے ہوئے صاحبِ جواہر نے سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الکہف تک (۱۸ سورتیں) ۸ ہزار سے زائد اصول و قوانین اخذ کر کے قاری کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ جن سے پوری انسانیت استفادہ کر سکتی ہے۔ ۴۲ صفحات میں صرف فہرستِ عنوانات آسکی ہے۔ مقدمہ بڑا تفصیلی ہے جس میں جامع مگر اجمالی اسلوب سے زندگی کے ہر شعبے کے متعلق دیگر نظریات اور نظاموں کے بالمقابل قرآنی نظام کو واضح کیا گیا ہے۔

دیباچہ نہایت مفید ہے جس میں بہت ہی اجمال سے معروف و متداول عربی تفاسیر اور اردو تفاسیر و تراجم کا تعارف کرایا گیا ہے۔ "بزبانِ اُردو" کی سرخی کے تحت جن چیزوں

کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے بعض میں بیان کے اندر جھول ہے یا کوتاہیاں۔ مثلاً تفسیر احمد (سرسید احمد خاں) کے متعلق یہ جملہ کہ "قرآنی تعلیمات اور سائنسی نظریات میں تطبیق کی مخلصانہ کوشش"۔ ہمارا اعتراض لفظ مخلصانہ پر نہیں، کیونکہ اچھے سے اچھا کام غیر مخلصانہ اور غلط سے غلط کام مخلصانہ طور پر کیا جا سکتا ہے۔ تفسیر احمدی اور سرسید احمد خاں کی دیگر مذہبی کتب کا امتیازی رنگ یہ ہے کہ انہوں نے مغربی طرز زندگی اور اسلام کے خلاف مستشرقین کے اُٹھائے ہوئے اعتراضات کے آگے سر جھکا دیا۔ بلکہ اسی اثر پذیری کے تحت انہوں نے سب سے پہلے انکارِ حدیث کے فتنے کے دروازے کھولے اور تجدد پسندی کی راہ دکھائی۔ اسی طرح غلام احمد پرویز کی معارف القرآن کے متعلق "نظام الوہیت کے اثبات" کے الفاظ سے حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ سیدھی طرح بتانا چاہیے تھا کہ یہ تفسیر "قرآنِ بلا سنّت" کے نظریے کے تحت لکھی گئی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کا تعارف بغیر "فلسفہ وحدتِ ادیان" کا ذکر کیے ہو ہی نہیں سکتا۔

جواہر القرآن کا بنیادی نظریہ اس خیال کی تردید کرتا ہے کہ "قرآن ایک مذہبی نوعیت کی مقدس کتاب ہے اور اس کا تعلق ان کے انفرادی اور نجی امور تک محدود ہے، بخلاف اس کے یہ عالمگیر اور ابدی مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

جلد اوّل زائد از نصف قرآن کے مطالب کو سمیٹے ہوئے ہے۔

معذرت چاہتا ہوں کہ جس ہجوم کار اور "ہجوم کتب" کے درمیان گھرا ہوں اس کی وجہ سے اتنی ضخیم کتاب کو پورا نہیں پڑھ سکا۔

اسلام کا نظامِ عفت و عصمت | مولفہ: مولانا محمد ظفیر الدین (رفیق ندوۃ المصنفین)

ناشر: مکتبہ نذیریہ ۷۔ چناب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔

سفید کاغذ، اچھے معیارِ طباعت کے ساتھ تقریباً چار سو صفحات سبز رنگ کا دبیز کاغذ۔ قیمت ۳۶/ روپے

اس کتاب میں عورت کے مقام اور اسلام میں اس کے تحفظِ ناموس و عصمت کے متعلق

تعلیمات و تدابیر اور قوانین و اقدار کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں ہم ترجمان القرآن ہی کے سابق تبصرے کو دوہراتے ہیں۔ (اگست ۷۷) :-

" زیر تبصرہ کتاب اسلام کے نظامِ عفت و عصمت پر ایک جامع اور فکر انگیز تصنیف ہے جس کی علمی حلقوں میں بہت پذیرائی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو کر بِک چکے ہیں"۔

کتاب میں" عورت لیگالٹی" مغربی معاشرے کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کے دانشوروں کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں

آئینہ ایام | مؤلف و ناشر: حافظ محمد انور صاحب۔ ۱۷۵ سی، سٹیلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ
۱۶۰ صفحات۔ قیمت دس روپے۔

حافظ صاحب بڑے شریف الطبع بزرگ ہیں۔ انہیں دیکھ کر ادب کرنے کو جی چاہتا ہے، مگر ان کی کتاب کا تبصرہ کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ تاہم ادائے فرض کے طور پر عرض ہے کہ ان اوراق میں اسلام کے شورائی نظام کا خاکہ پیش کیا گیا ہے مگر ان کے دعاوی اور دلائل ایسے ہیں کہ میں ان کی قدر و قیمت کو سمجھ نہیں سکا، اور گفتگو کے دوران جو کچھ میں نے عرض کیا اُسے وہ نہیں سمجھ سکے۔ جمہوریت کی مخالفت کا جو موسم بہار پچھلے دنوں جوبن پر تھا اس کے زیر اثر اس کتاب میں اختیار کردہ تصورِ شورائیت کچا معلوم ہوتا ہے اور سعیٔ استدلال سطحی۔ مثلاً مطالعہ سے ایک نکتہ مجھے یہ ہاتھ آیا ہے کہ مارشل لا بڑی نعمت ہے اور دوسرا یہ کہ ایک امیر ایک رکن شوریٰ کی رائے پر بھی کوئی فیصلہ و اقدام کر سکتا ہے۔ اب باقی سارے نکتے کیسے بیان ہو سکتے ہیں۔

مگر اتنا مجھے اعتراف ہے کہ حافظ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، نیک دلی اور خلوص سے لکھا ہے۔ اُن کا یہ حق مجھے تسلیم ہے کہ وہ کسی معاملے میں جو چاہیں رائے رکھیں۔

علوم القرآن (انگریزی) مؤلف احمد وان ڈینفر (AHMED VON DENFFER)[1]

ناشر: اسلامک فاؤنڈیشن ۲۲۳ لندن روڈ ۔ لائسٹر (LE2 1ZE - U.K) ، دوسو کے قریب صفحات ۔ قیمت درج نہیں ۔

بہت اچھی انگریزی میں لکھی ہوئی یہ کتاب بہت اچھے کاغذ پہ بہت اچھے ٹائپ سے شائع شدہ ہے اور اس کا پیپر بیک ٹائیٹل بھی خوب ہے ۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے سیوطی کی الاتقان یاد آئی ۔ خلاصہ مدعا یہ کہ قرآن کیا ہے ، قرآن کیسا ہے ، قرآن میں کیا کچھ ہے ، اس کی ترتیب اس کے مباحث کیا ہیں ۔ نیز کون سی سورتیں مکی ہیں ، کون سی مدنی اور آیات میں محکم و متشابہ اور ناسخ و منسوخ وغیرہ کی تقسیم ، وحی کا مفہوم ، متنِ قرآن کا نزول ، شانِ نزول ، حفاظتِ قرآن اور کتابتِ قرآن کے انتظامات اور مستشرقین کے اعتراضات کے جواب اس میں پیش کر دیئے گئے ہیں ۔ انگریزی زبان میں اپنے موضوع پر غالباً یہ پہلی کتاب ہو گی ۔

نور ستان از قلم حکیم محمد سعید صاحب ، ناشر : ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ، ہمدرد سنٹر ، ناظم آباد ۔ کراچی ۱۸ ۔ خاصے بڑے سائز کے ۴۴ ۵ صفحات ۔ کاغذ سفید اعلیٰ ، کتابت و طباعت دل آویز ۔ دبیز رنگین ٹائیٹل ۔ قیمت : اعلیٰ ایڈیشن (جو زیر تبصرہ ہے) ۱۵۰/۔ روپے ، عام تبلیغی ایڈیشن ۵۰/۔ روپے ۔ عام ایڈیشن کی اتنی کم قیمت اس کے پھیلانے میں بہت مدد دے گی ۔

حکیم صاحب محض طبیب ہوتے اور ہمدرد دواخانہ چلاتے تو بھی ان کی شخصیت تا دیر جگمگاتی رہتی ، مگر انہوں نے سماجی اور علمی و ادبی دائروں میں جن گوناگوں خدمات کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے ان کی وجہ سے وہ ملک کے چند بڑے دانشوروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں ۔ وہ صرف دانشور ہی نہیں ، مسلم دل و دماغ سے آراستہ ہیں ۔ "نور ستان" میں ان کے اسلامی شعور و جذ

---

[1] تحقیق نہیں کر سکا کہ اس نام کا اردو تلفظ کیا ہے ! (ن ۔ ص)

کا زوردار انعکاس سامنے آتا ہے۔
یہ ضخیم کتاب حکیم صاحب کی اُن نشری تقریروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے "قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی" کے عنوان کے تحت ریڈیو پاکستان سے نشر فرمائیں۔ ان ۱۴۱ تقاریر کو چند بڑی سرخیوں کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ ۱۔ ایمانیات ۲۔ قرآن کی روشنی ۳۔ رحمتِ عالم ۴۔ عبد اور معبود ۵۔ برکاتِ رمضان ۶۔ علم و حکمت ۷۔ تزکیہ نفس اور عمل ۸۔ تہذیبی اقدار اور تقاضے ۹۔ انسان اور معاشرہ ۱۰۔ آوازِ اخلاق ۱۱۔ سماجی برائیاں ۱۲۔ صاحبِ ایمان کا کردار ۱۳۔ صحت و زندگی۔
ان تقاریر میں آیاتِ [illegible] سے پوری رہنمائی لی گئی ہے اور تمام ایمانی، اخلاقی اور اجتماعی تقاضوں کی تشریح بہت ہی آسان زبان میں کی گئی ہے۔ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچنی چاہیے۔
میرے دل میں حکیم محمد سعید صاحب کی جو قدر ہے اس میں اس کتاب نے اور اضافہ کیا ہے۔

تحریکِ اسلامی منزل بہ منزل | از چوہدری لعل دین سلیم۔ ناشر: تحریک پبلیکیشنز، جامعہ کلاتھ مارکیٹ، کچہری بازار، فیصل آباد۔ کتابت، طباعت، سرورق دیدہ زیب۔ کاغذ سفید، ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت: ۶ روپے

"تحریکِ اسلامی منزل بہ منزل" چوہدری لعل دین سلیم امیر تحریک اسلامی ضلع فیصل آباد کی ایک تقریر ہے جو انہوں نے تحریک اسلامی صوبہ پنجاب کی متعدد تربیت گاہوں میں کی تھی اور اب اسے کارکنانِ تحریک کے بار بار کے اصرار پہ کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔
اس کتابچہ میں تحریکِ اسلامی کی رودادِ سفر کو چھ منزلوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ ایک قاری کے ذہن میں محمد بن قاسم کی برصغیر پاک و ہند میں آمد سے لے کر قیامِ پاکستان، سقوطِ ڈھاکہ اور اس کے بعد کی تاریخ واضح ہو جاتی ہے۔ نیز برصغیر پاک و ہند میں تحریک اسلامی کا اجمالی مگر جامع جائزہ اس کے ابتدائی دور سے لے کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وفات کے حالات

تک پیش کیا گیا ہے۔ سلسلۂ کلام میں علامہ اقبال اور مولانا مودودیؒ کی فکری و مقصدی ہم آہنگی کا ذکر کرتے ہوئے اس تاریخی واقعہ کو اجاگر کیا گیا ہے کہ علامہ ہی کی پُر اصرار دعوت پر مولانا حیدرآباد سے پنجاب میں منتقل ہوئے۔

مؤلف نے مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی کے قیام پاکستان سے پہلے کے خوشگوار روابط پر مذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ متحدہ ہندوستان کے آخری چھ برس مولانا مودودیؒ کی تحریریں سے مسلم لیگ کو بڑی تقویت ملی۔ لہٰذا جماعتِ اسلامی پر قیام پاکستان کی مخالفت کا الزام بے بنیاد اور غلط قرار دیا ہے۔

سلیس زبان میں لکھا ہوا یہ کتابچہ تحریک اسلامی کے کارکنان کے لیے قیمتی اثاثہ ہے۔ اس کا مطالعہ تحریک کے نوجوان کارکنوں کو خاص طور پر مطالعہ کی نئی راہیں فراہم کرے گا۔ اس کتابچہ کا حرفِ اوّل امیر تحریک اسلامی لاہور سید اسعد گیلانی نے لکھا ہے۔

(تبصرہ از پروفیسر افتخار احمد تلخیص)

کیا قافلہ جاتا ہے | مؤلفہ: نصر اللہ خاں (مشہور صحافی)، ناشر: مکتبہ تہذیب و فن سی ۶۳ بلاک ایچ، نارتھ ناظم آباد کراچی۔ ۲۵۵ صفحات مجلد مع گرد پوش۔
قیمت: ۴۰/ روپے

ہمارے بزرگ صحافی (اور کالم نگار) نصر اللہ خاں ۱۹۳۸ء سے پرورشِ لوح و قلم کر رہے ہیں۔ اس عرصے میں سرو کی طرح اُن کی کالم نگاری کا قدِ امتیاز بلند ہوتا چلا گیا۔ کیا خوب کہا، ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا کہ "ہم کہہ سکتے ہیں کہ صحافت نے ہمارے ادب کو جو چند صفِ اوّل کے طنز و مزاح نگار دیے ہیں، خاں صاحب ان میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں"۔ "کیا قافلہ جاتا ہے" ۵۲ اہم شخصیتوں کے خاکوں کا مجموعہ ہے، جس کی نوعیت یادِ رفتگان کی سی ہے۔ علمی، ادبی، نثری، صحافی، مختلف دوائر سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں کے انتخاب میں نصر اللہ خاں صاحب کے اچھے ذوق کا سراغ ملتا ہے۔ پھر ان کی اس شان سے

سادہ تصویر کشی کی ہے کہ جانے والے لوگ ہمیں آس پاس کام کرتے، بحثیں کرتے، چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ کتاب اُردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے اور اس کی ترتیب میں مشفق خواجہ نے حصہ لے کر ایک خدمت انجام دی ہے۔

یادِ رفتگان | مؤلف: جناب ماہر القادری مرحوم و مغفور ، مرتب: جناب طالب ہاشمی
ناشر: البدر پبلی کیشنز، راحت مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد بندی اعلیٰ، خوشنما گرد پوش، صفحات: ۴۱۰، قیمت: ۴۲/- روپے (نہایت مناسب)

ماہر القادری مرحوم "بنارس" سے چلے اور "حرم میں اذانِ سحر" تک پہنچے۔ انہوں نے اپنے فکر و فن کو انقلاب سے گذارا، یہاں تک کہ وہ اسلامی ادب کی محفل کے صدر بنے۔ ماہر صاحب کی شخصیت کے امتیازات کو سمجھنے کے لیے حبیب احمد صدیقی صاحب کا لکھا ہوا اجمالی خاکہ (بہ حیثیت پیش لفظ) بہت اہم ہے۔ ماہر صاحب نے جاتے قافلے کی ۶۲ شخصیتوں پر تاثرات لکھے تھے کہ پھر وہ خود بھی اس قافلے میں شامل ہو گئے۔ طالب ہاشمی صاحب کو جو گہری محبت ماہر صاحب سے تھی اس کے زیر اثر انہوں نے "یادِ رفتگان" کے عنوان سے لکھی ہوئی ماہر صاحب کی تحریروں کو بڑی خوبصورتی سے جمع اور مرتب کیا۔ دلچسپ یہ کہ ماہر صاحب کی اپنی ہی ایک تحریر "درسِ عبرت" کے نام سے ان کے لکھے ہوئے تاثرات کا پیرایہ آغاز بن گئی۔

ماہنامہ بتول سالنامہ ۱۹۸۳ء | مدیرہ مسئول جناب سلمٰی یاسمین نجمی، مدیرہ نسیم آرا۔
مدیرہ کا پتہ۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲ راولپنڈی صدر، ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ بتول، ۸ سلطان احمد روڈ، اچھرہ، لاہور۔

ماہنامہ بتول ایسی خواتین کا جریدہ ہے جو اپنی زندگیوں کی روح رواں اسلام کو سمجھنے

ہیں، اور قلم اور فن کو اسلامی قدروں کے غلبہ کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اس مبارک مقصد کے ساتھ یہ جریدہ کئی سال سے مسلسل کام کر رہا ہے اور برابر ارتقا کر رہا ہے۔ اس کی ترقی کا اندازہ اس دہ سالہ جائزہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو پروفیسر فروغ احمد صاحب جیسے فاضل ادیب، شاعر اور ناقد نے لکھا ہے۔

تفصیلی رائے دینا مشکل ہے، لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ بڑی حد تک عام شماروں میں بھی اور خصوصیت سے اس سالنامے میں خواتین اور نوخیز طالبات نے اتنی اچھی ادبی تحریریں پیش کی ہیں کہ جیسے یہ دکھا دینا ہے کہ اسلام پسند صنفِ نازک ادب کی نزاکت کاری میں شاید مردوں سے بازی لے جائیں گی۔ خصوصاً کہانی کی صنف میں ہم مردوں کے رسالوں میں جو کمی پاتی جاتی ہے، بتول کی پیش کش قابلِ رشک ہے۔ علی الخصوص خود سلمیٰ یاسمین نجمی نے ادب نگاری میں جس تیزی سے ترقی کی ہے وہ ہمارے لیے سرتاپا مسرت ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس "عورت بگاڑ" دور میں نسوانیت کی پاکیزہ نشوونما کے لیے ایسا شاندار رسالہ اپنا کام اچھی رفتار سے کر رہا ہے۔

محض تعارف

نظام المساجد از مولانا محمد ظفیر الدین۔ ناشر: عمران اکیڈیمی، ۴۰ بی، اُردو بازار لاہور۔ قدرے بڑے سائز کے ۴۴۲ صفحات۔ قیمت: ۲۵/- روپے

نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید مرتب و ناشر: تنظیم اساتذہ پاکستان۔ ۸۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔ صفحات ۴۸۔ قیمت: ۴/- روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، استاذ محمد قطب، ڈاکٹر محمد بن سعد الرشید اور پروفیسر خورشید احمد کے ۴ مقالات کا مجموعہ۔

بلوچستان کے تعلیمی ادارے اور نظم و ضبط کے چند پہلو | مرتبہ ڈاکٹر انعام الحق کوثر
ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز ۳-۵۶ شالیمار، ۶/۴ - اسلام آباد -
بہت اچھا معیار طباعت - صفحات: ۵۶ قیمت: ۱۲/- روپے

ذکری دین کی حقیقت | تصنیف، مفتی احتشام الحق صاحب آسیا آبادی - ناشر: مجلس تحفظ ختم نبوت - شارع اقبال، کوئٹہ - قیمت درج نہیں -

سیاسی جماعتوں کی شرعی حیثیت | از جناب محمد امین فاضل ریاض یونیورسٹی، سعودی عرب -
ناشر: ادارۂ ادبستان، جوہر پریس، جوہر آباد ضلع خوشاب - اچھا تحقیقی مقالہ ہے -
قیمت: ۵/- روپے

مولینا شمس الحق عظیم آبادی | از جناب محمد عزیر - ناشر: علمی اکیڈمی ۹/۶۶۷ دستگیر کالونی، فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸ - برصغیر کی ایک ممتاز علمی و دینی شخصیت پر بہت اچھا تحقیقی کام -
طباعتی معیار اعلیٰ - صفحات ۱۴۲ - قیمت: ۳۵/- روپے -

جہاد افغانستان اور افغان مہاجرین | از قاضی حسین احمد - شائع کردہ مکتبہ منصورہ، لاہور ۱۸ صفحات: ۱۹ قیمت: ۱/۵۰ روپے -

عورت کی نصف دیت | از مولانا فہیم عثمانی ایم اے - ناشر: دارالکتب، دھوبی منڈی پرانی انارکلی، لاہور - صفحات: ۸۰ قیمت درج نہیں -
اس اجماعی مسئلے کے خلاف پروفیسر طاہر القادری کے موقف کا مکمل تجزیہ کیا ہے -

قومی وحدت اور پائیدار جمہوریت کی مضبوط بنیادیں | از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ -
ناشر مکتبہ منصورہ، لاہور ۱۸ قیمت درج نہیں -

فکر آخرت | مرتبہ: محمد اکرم قریشی ایم اے - ناشر: احیائے دین لائبریری، مسجد ضلع کچہری سیالکوٹ - صفحات ۳۱ - قیمت درج نہیں -

پنج سورہ شریف | از مولوی محمد عبداللطیف افضل - مؤلف سے کامران فین انڈسٹری گجرات کے پتے پر حاصل کریں - اس میں سورہ یٰسین، الرحمٰن، واقعہ، ملک، مزمل کا منظوم پنجابی ترجمہ دیا گیا ہے - صفحات ۵۶ قیمت: ۶/- روپے -

(بقیہ اشارات) اُسے یا اس کے بچوں کو مواقعِ استفادہ سے حصہ پانے میں مساوات حاصل نہ ہو۔ غریب طبقے کے افراد اور ان کے بچوں کو ہسپتالوں اور تعلیم گاہوں میں یکساں شرائط پر داخلہ مل سکے، بلکہ جہاں مالی بوجھ رکاوٹ بنتا ہو، وہاں ایک خاص آمدنی (آمدنی کو افرادِ خانہ پر تقسیم کر کے دیکھا جانا چاہیے) سے کم حیثیت کے شہریوں کو خصوصی مراعات دی جائیں۔ خاص طور پر خوانچہ فروشوں اور کسانوں کا بہت لحاظ کیا جائے۔

انصاف کے معنی یہ بھی ہیں کہ قومی دولت سے معاوضے اور مراعات حاصل کرنے والی بھاری تعدادِ ملازمین کی تنخواہوں کے معیار اور نسبت کو اس طرح سے بدلا جائے کہ کم سے کم درجے کے ملازم کو کنبے کی کفالت کے لحاظ سے انتہائی ناگزیر آمدنی ضرور حاصل ہو، اور اس کا حساب قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ اور اعشاریے سے لگایا جائے۔ اس حساب پر ہر دس یا پانچ سال بعد نظرِ ثانی کی جائے۔ اس طرح اوپر کے بڑے سے بڑے عہدہ داروں کو بس اچھی گذربسر کے ذرائع فراہم کیے جائیں، مگر ضرورت سے زیادہ پیسہ دے کر انہیں اسراف و تبذیر کی مسابقت میں نہ دھکیلا جائے، ورنہ یہ طبقہ سارے معاشرے میں معاشرتی اور ثقافتی فتنوں کو فروغ دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایران میں انقلاب کے زور سے تنخواہوں کی تفاوت کو ۱ : ۵ کی نسبت تک لایا گیا ہے۔ ہمارے یہاں فی الحال اگر ۱ : ۱۰ پر بھی بات آجائے تو آئندہ مزید بہتری تدریجاً ہو سکتی ہے۔ اتنی تبدیلی بھی بہت سی خرابیوں کا ازالہ کر دے گی۔

انصاف کا تقاضا یہ بھی ہے کہ غیر مالک کاشت کاروں کی بہت بڑی آبادی کو فقر و فاقہ، جہالت، بیماری اور ذلت کے گرداب سے نکالنے اور جاگیرداروں اور وڈیروں کی طرف سے تبذیر اور عیاشی، سیاسی تخریب، اخلاقی بگاڑ، جرائم کی سرپرستی، بیوروکریسی پرستی، غنڈوں کی بھرتی، اصلاحی و تعمیری کاموں میں مزاحمت، کاشتکاروں اور دیگر غریب عناصر پر مظالم وغیرہ حرکتوں کا سدّ باب کرنے کے لیے تمام جاگیریں اور بڑی زمینداریاں توڑ کر غیر مالک کاشتکاروں کو مالک بنایا جائے، نیز انہیں نو برآمد شدہ اور نو تیار شدہ زمینوں پر آباد کیا جائے۔

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انکم ٹیکس کے نظام کو عادلانہ بنایا جائے اور آج اس کا جو بھاری بوجھ درمیانہ اور نچلے درمیانہ تنخواہ دار طبقے پر بلا لحاظ ان کی کفالتی ذمہ داریوں

کے ڈال دیا جاتا ہے جس سے بہت کم ہو جاتے۔ اسی طرح انتہائی جانکاہی اور پتہ ماری سے علمی و دینی کام کرنے والے لوگوں کو امکانی حد تک استثنیٰ دیا جائے۔ بحالاتِ موجودہ کم سے کم ۲۵ .. ۳۰ ہزار روپیہ سالانہ آمدنی کو ٹیکس سے آزاد رہنے دیا جائے۔ اس سے اوپر ۵۰ ہزار تک ہلکا سا ٹیکس ہو، پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک شرح قدرے زائد ہو، اس سے زیادہ آمدنی پر ممتاز الگ شرح سے ٹیکس کو حسبِ ضرورت بڑھایا جائے۔ ٹیکس کی بے شمار اقسام کی موجودہ صورت میں ایک ایک چیز پر کئی کئی قسم کے ٹیکسوں کے ردّے چڑھتے چلے جاتے ہیں اور ایک ایک شخص کو کئی کئی اطراف سے ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ یہ ایچ پیچ ختم کر کے سیدھے سبھاؤ دو ایک ٹیکس رکھے جائیں۔ نیز عام اور بالخصوص غریبوں کی عام استعمال کی اشیائے ضرورت پر کوئی ٹیکس نہ لگایا جائے۔ بھاری ٹیکس آسائش، آرائش اور نمائش کے سامانوں پر لگائے جائیں، بالخصوص اس قسم کے درآمدی سامانوں پر بالواسطہ ٹیکسوں کو کم کر کے براہِ راست قسم کے ٹیکس زیادہ لگائے جائیں۔

ٹیکسوں کا موجودہ نظام چونکہ نہ منصفانہ ہے اور نہ اسلام کے اخلاقی رجحانات اور نہ مصالحِ ملت کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اس وجہ سے یہ ذریعہ بن گیا ہے پورے معاشی نظام میں بے انصافی اور بدعنوانی[1] پھیلانے کا۔

---

[1] کوئی بھی ناجائز قسم کا نظامِ کار فی نفسہٖ بدعنوانی پھیلانے کا موجب بنتا ہے، لیکن جب اس کے ساتھ افسران کے ذاتی اختیاراتِ تمیزی بھی شامل ہو جائیں تو پھر افسر اور اسامی کے درمیان سودا شروع ہو جاتا ہے۔ آج ٹیکس دہندگان کے کاغذات کو ردّ کر کے کوئی افسر اپنے اندازے سے اس کے سرمایہ، اس کے کاروبار، اس کی آمدنی اور اس کے منافع کی مقدار متعین کر کے جتنا چاہے ٹیکس لگا دے اور جسے چاہے سستا چھوڑ دے۔ اگر کسی اسامی کو شکایت ہو تو وہ پہلے ٹیکس ادا کرے اور پھر اپیلوں کے لمبے چکر میں پڑا رہے۔ حالانکہ سیدھا سا طریقہ یہ ہے کہ افسر نے اگر کسی کے گوشوارے کو ناقابلِ اعتماد ٹھہرایا ہے تو معاملہ ہائی کورٹ کی سطح کے کسی جج

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

انصاف کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ملک کے تمام صوبوں کو یکساں مقام دیا جائے، جہاں پسماندگی ہو وہاں سرمایہ لگا کر مختلف اسکیموں کے تحت ترقی کی رفتار تیز کی جائے، ہر صوبے کے لوگوں کو ملکی سطح پر مساویانہ حقوق حاصل ہوں، ہر صوبے سے فوج اور ملازمین کی بھرتی کی جائے، ہر صوبے کے طالب علموں کو تعلیمی ترقی حاصل کرنے کے لیے راستے کھول دیے جائیں۔ اسی طرح مختلف اقلیتوں کو اور مختلف معاشی اور سیاسی طبقوں کے لوگوں کو ترقی کے مواقع اور حقوق مساویانہ درجے ہی دیے جائیں۔ انصاف یہ بھی ہے کہ غریبوں اور کمزور لوگوں کو اُوپر اُٹھانے کے لیے خاص تدابیر کی جائیں۔ مستضعفین کو مستکبرین کی گرفت سے نکال کر ان کی اُونچ نیچ کو تدریجاً کم کر کے صفِ واحد میں لایا جائے۔

انصاف کا تقاضا یہ بھی ہے کہ نہ صرف مختلف صوبوں میں بلکہ مختلف علاقوں اور ضلعوں اور تحصیلوں میں، بلکہ شہروں کی طرح دیہات میں بھی تعلیم، علاج، بجلی، پانی پینے کے لیے بھی اور آبپاشی کے لیے بھی، سوئی گیس، ٹیلی فون اور سڑکوں اور بسوں کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ ملک کا کوئی کونہ ترقی کے ان ذرائع سے محروم نہ رہے۔

جن شہروں، جن ضلعوں اور جن دیہی علاقوں کو اس سلسلے میں شکایات ہیں ان کی تکالیف کا ازالہ کیا جائے اور ایک شہر اور دوسرے شہر یا ایک ضلعے اور دوسرے ضلعے یا ایک دیہی علاقے اور دوسرے علاقے کے درمیان ترجیح و عدم ترجیح کا فرق نہ رہے۔

یہ درست ہے کہ اتنا بڑا کام ایک ہلے میں نہیں ہو سکتا مگر ۵ سالہ یا ۰ سالہ منصوبے کے تحت اسے ضرور کیا جا سکتا ہے۔

انصاف کا نام لیں تو فوری طور پر مزدوروں کا طبقہ نگاہوں میں آجاتا ہے۔ اس طبقے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کے پاس جانا چاہیے جو ٹیکس کی نزاعات کے لیے خصوصاً مامور ہو۔ وہ قانونی خطوط کے مطابق موقع پر کاروبار کی حالت، پچھلے حسابات، موقع کے دوسرے لوگوں، شخص متعلق کی جائیداد اور مالی حیثیت اور اس کے رہن سہن کا جائزہ لے کر عدالتی فیصلہ لکھے کہ اس کی حیثیت کیا ہے۔

رکھتے ہوں، لادین اور اشتراکی عناصر اور دیگر اہلِ فتنہ سے ساز باز کرنے والے ہوں، تو پھر اُن کے معاملے میں بے بسی پیش آسکتی ہے [illegible] سی مجبوری [illegible] تو صبر۔ اسلام کے ایسے نادان دوستوں کو ان کے حال پہ چھوڑ دینا چاہیے۔

بس اصولی مشورہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، ایک ایک حلقے میں دو دو، تین تین خادمانِ اسلام اکھاڑے میں نہ اُتر جائیں، بلکہ کسی ایک کے حق میں بقیہ حضرات خیر خواہیٔ دین اور خیر خواہیٔ قوم کے لیے دست کش ہو جائیں۔ اگر کوئی دینی و سیاسی دونوں لحاظ سے ایسا اچھا آدمی مل جائے جو معرکۂ انتخاب میں کچھ زور دار بازی لڑ سکتا ہو تو اسے تائید بہم پہنچا دینا بھی اصل مقصد کے لیے مفید ہے۔ بس آدمی کم سے کم بدنام قسم کا نہ ہو، حرام روزی اور لغو مشاغل سے پاک ہو، تعاون چاہنے والا اور تعاون کرنے والا ہو اور اس پر اعتماد کیا جاسکے، محض ننگ پورا کرنے والی بات نہ ہو۔

اِس صورت میں لادینیت پسندوں اور مفاد پرستوں کے خلاف زیادہ وسیع اور مضبوط محاذ قائم کیا جاسکتا ہے۔

نویں بات یہ کہ ایسا نہ ہو کہ غلبۂ اسلام کے شوق میں جذباتِ تند کی رَو میں آکر محبانِ اسلام جگہ جگہ اپنے نمائندے کھڑے کر دیں اور یہ لحاظ اس کے کہ ان کی ذات کتنا اثر و رسوخ رکھتی ہے اور حلقوں کے عوام کا رجحان اُن کی طرف کتنا ہے۔ شخصیتیں بھی موزوں ہونی چاہئیں اور حلقہ ہائے انتخاب میں ان کے لیے عوامی دلچسپی بھی ہونی چاہیے۔ یہ دونوں باتیں اگر نہ دیکھی جائیں گی تو کہیں اچھے حلقوں میں شخصیتوں کی کمزوری کی وجہ سے میدان ہاتھ سے جاتا رہے گا اور کہیں ممتاز اور قابل شخصیتیں حلقوں کی کمزوری کی وجہ سے پٹ جائیں گی۔

قدم آگے ضرور بڑھانا ہے مگر پکی زمین پہ پیر مضبوطی سے لگانا ہے۔ پیر کمزور ہوا تو بھی پیش قدمی مشکل اور زمین کچی ہوئی تو بھی اقدام محال۔

انتخابات کا معاملہ شطرنج کے کھیل کی طرح پیچیدہ ہوتا ہے۔ آپ ایک مہرے کو آگے

سے جتنی محنت لی جاتی ہے اور اس کے ذریعے جتنی کمائی کی جاتی ہے اس کے مطابق اسے مناسب اُجرت نہیں ملتی۔ اُجرت میں معقول اُجرت کے ساتھ اقامت، تعلیم، علاج اور سفر کی سہولتیں بھی شامل ہیں۔ صنعتی پیداوار اور اس کے معیار کو بڑھانے کے لیے بھی اچھی اُجرت دینا لازم ہے۔ مختلف پہلوؤں سے اُجرت میں معقول اضافے، قیمتوں کے انڈکس اور اوسط حد تک زیر کفالت کنبے کو ملحوظ رکھ کر ان کی خدمت کی جاسکے۔ نیز مزدوروں کے علاوہ صنعتی مفاد کے لحاظ سے بھی یہ تدبیر شدید اہمیت رکھتی ہے کہ نقد بونس کے علاوہ سالانہ بونس شیئرز دے کر ان کو ملکیتِ کاروبار میں شریک کر لیا جائے۔ اس کا حق انہیں اس لیے ہے کہ وہی اس کو نشوونما دینے کا وسیلہ ہیں، تنہا روپیہ تو کچھ نہیں کر سکتا۔

تو اجمالاً یہ ہے ہمارا وسیع تصورِ انصاف جو اسلامی اصولوں سے مطابقت رکھتا ہے۔

اب آٹھویں گذارش!

"ایمان ـــ امن ـــ انصاف" کے طغریٰ کے ساتھ سامنے آنے والے خادمانِ اسلام کو اس امر کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ ان کا اصل مقابلہ مخالفینِ دین، انحراف پسندوں، اغیار پرستوں اور بندگانِ مفاد سے ہے۔ اس مقابلے میں وہ اسی صورت میں جیت سکتے ہیں کہ وہ صحیح سیاسی و معاشی شعور کے ساتھ غلبۂ اسلام کے لیے کام کرنے والے دوسرے لوگوں سے جگہ جگہ ٹکراتے نہ رہیں۔ کوشش کرنی چاہیے کہ احیائے نظامِ اسلام کے لیے موزوں ذہن و کردار والے کسی ایک ہی فرد کی تائید مختلف حلقے کریں۔ اس کے لیے رابطے، گفتگوئیں، افہام و تفہیم وغیرہ کے طریقے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

البتہ ایک ایسی مشکل صورت بھی ہوسکتی ہے کہ محدود مذہبیت والے ایسے تنگ نظر، جذباتی اور فرقہ پرست لوگ سامنے آجائیں جو پوری طرح اسلامی نظام اور اس کے طریقِ اقامت کا شعور بھی نہ رکھتے ہوں۔ موجودہ صورتِ حالات میں مختلف مخالفِ اسلام نظریات اور تحریکوں سے بھی ناآشنا ہوں۔ ذاتی کردار کے لحاظ سے بھی اسی کردار کے پہلو سے واضح کمزوریاں

بڑھانے سے پہلے حریف کے سولہ مہروں کی پوزیشن اور امکاناتِ حرکت کو پہلے دیکھتے ہیں، جن کی چالیں مختلف قسم کی ہیں۔

لہٰذا مقام جذبات اور خوش فہمیوں کا نہیں، تدبر و فراست کا ہے

دسویں اور آخری گزارش یہ کہ جو افراد اسلامی مقاصد کے لیے میدان میں آئیں، وہ ابتدا ہی میں اپنے سابق ذاتی نظریات و ارشادات کے ریکارڈ کو بھی دیکھ لیں اور اگر کسی گروہ سے ان کا تعلق رہا ہو تو اس کے سیاسی نظریات، جمہوری تصورات اور انتخابی پالیسی کے پچھلے ادوار کو بھی ملاحظہ فرمالیں۔ ایسا نہ ہو کہ جن باتوں کو اصولی اہمیت دے کر بڑی تحدی اور تکرار سے پیش کیا جاتا رہا ہو اب ان کی خلاف ورزی شروع کر دی جائے۔ اپنی تاریخ فکر و مسلک سے محض اس عذر کی بنا پر انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ اس سال کا ہندسہ ۱۹۸۴ ہے، یا یہ انتخابات مارشل لا کے تحت ہو رہے ہیں، یا یہ کہ ان کی نوعیت غیر جماعتی ہے۔

یہ تھے چند ضروری مشورے جنہیں میں پوری خیر خواہی سے سیاسی دلچسپی رکھنے والے محبانِ اسلام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ خدا کرے ان میں کچھ افادیت ہو اور انہیں غور سے پڑھا جائے۔

کتابت شدہ کاپیاں پریس جا رہی تھیں کہ صدر پاکستان کی تقریر نشر ہوئی جس میں ریفرنڈم کا اعلان کیا گیا۔ اس سے صورتِ حالات میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اشارات کو پڑھتے ہوئے اسے ملحوظ رکھیں۔ (مدیر)

تفہیم القرآن

جلد دوم

جو کہ ایک عرصے سے ختم ہو چکی تھی۔ اب دوبارہ چھپ

چکی ہے۔ قارئین کرام اپنے آرڈر پیشگی بک کروا سکتے ہیں۔

ادارہ

ترجمان القرآن لمیٹڈ

۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ

لاہور

عازمین حج کے لئے زاد سفر کا اہتمام

مشاہداتِ حرمین

سید اسعد گیلانی

مقدس مقامات کا تعارف اور تاریخی پس منظر،
ایمان افروز تفصیلات اور حیات آموز تعلیمات،
جذبہ حج کو ابھار کر عروج پر لانے کا اہتمام۔
بیت اللہ شریف کے ۲۲ مقامات اور مدینہ منورہ کے ۲۲ مقامات کا تعارف
مناسک حج کی تمام ضروری تعلیمات و تفصیلات کا خلاصہ اور نچوڑ،
یہ کتاب حاجیوں کے لیے سب سے زیادہ قیمتی

سرمایہ
اثاثہ
تحفہ اور
زاد راہ ہے۔

اس کے بغیر آپ کا سامان سفر نامکمل رہے گا۔

ضخامت : ۲۴۰ صفحات
سائز : ۱۸ × ۲۲ / ۸ قیمت : -/۲۴ روپے